جلد ۴۱	ماہ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۸ء	عدد ۴

مضامین

شذرات

ہم نے پچھلے پرچہ میں ملایا کے دو نو مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے لئے دو وظیفوں کیلئے جو صدا لگائی تھی وہ ملت کے دو بزرگوں کے کانوں تک پہنچی، لیکن چونکہ اظہار نام کے تفاخر کے بجائے اخلاص کے پردہ میں ستر حال کا حکم ہے، اس لئے اسی اخفا کیساتھ شکریہ کا فرض بھی ادا کیا جاتا ہے، ہماری قوم میں یہی چند ہستیاں ہیں جو ہر دور نیک کمتی ہیں، خدا انکی عمر و عمل میں برکت دے،

یہ دونوں طالب العلم ۶ اپریل کی شام کو لکھنؤ مدرسہ ندوۃ العلماء میں پہنچ گئے، ندوۃ العلماء میں اس قسم کے اور بھی متعدد طالب العلم آئے ہوئے ہیں، جو اردو نہیں جانتے، ان کی مذہبی تعلیم کا کام بہت مشکل ہے، پھر بھی ندوہ اپنی مالی بے مایگی کے باوجود دین کی خدمت کا خاموش جذبہ رکھتا ہے، اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اے کاش کہ ہماری قوم میں اس "چپ کی داد" دینے کا شوق ہوتا،

ہم نے جب کبھی اپنی قوم کی غیرت کے لئے ان کے دوسرے ہموطنوں کے قابل رشک کارناموں کا حوالہ دیا ہے تو ہمارے بعض حساس دل بزرگوں نے اس میں اپنی قومی توہین سمجھی ہے، اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے، مگر جب غیروں میں وہ چیز نظر آتی ہے جو اپنوں میں چاہیئے تھی تو رشک و غبطہ کے بوجھ سے خیال کا توازن قائم نہیں رہتا،

ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا،

مسلمانو، تمہارا بھی کوئی گروکل ہے، اور تم اس کے لیے سال میں کیا نذرانہ دیتے ہو، ایک لاکھ، پچاس ہزار، پچیس ہزار کچھ؟

آجکل کی نئی وزارتیں اپنے اپنے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے بنا رہی ہیں، جو خاکہ بنے گا وہ عمل میں بھی آئیگا، اور اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی، وردھا اسکیم اور سی پی کے ودیا مندر کی تجویز سب کے سامنے آچکی ہے، حکومتوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھیں، یہ بات تو اب بھی ہے یعنی سرکاری ادارے مذہبی تعلیم سے خالی ہیں، مگر چونکہ پہلے تعلیم جبری نہ تھی اور نہ ساتویں برس سے سرکاری تعلیم میں جُت جانا سب پر قانون کے رو سے واجب تھا، اس لئے گھروں پر ابتدائی مذہبی تعلیم پاکر مسلمان بچے سرکاری مدرسوں میں جا سکتے تھے، اور جاتے تھے، مگر اب اس جبری تعلیم اور مقررہ عمر میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے یہ معاملہ ہمارے لئے بیحد قابل غور ہے،

دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو سو فیصدی مٹا ڈالنے کیلئے کوشاں ہیں وہ آپ کا انتظار کئے بغیر چل کھڑی ہونگی، اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے ان کے درمیان فیصدی خواندگی کا جو فرق پیدا ہو جائے گا وہ پھر مٹائے نہ مٹیگا، اس لئے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کا بہانہ جبری تعلیم سے رہائی پانے کے لئے کام میں نہ لائیں، بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح اٹھیں اور مذہبی اور ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں، ان میں سو فیصدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کر کے دکھا دیں، یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں،

لیکن اگر حکومتیں مذہبی تعلیم کے بارے سبکدوشی چاہیں، تو کیا مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہو جائیگا؟ اس وقت ضرورت اس کی ہوگی کہ مسلمان کسی ادارہ کے ماتحت ابتدائی مذہبی تعلیم کا جال پورے ملک میں پھیلا دیں، اس کے لئے سرمایہ ہو، کتابیں بنائی جائیں، چھاپی جائیں، اردو خط اور قرآن پاک کی تعلیم کی مشکلوں کو عملاً حل کیا جائے، اس کے لئے ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے ماہر مل کر بیٹھیں اور کوئی نظام بنائیں اور

اور اس پر عمل کی راہیں نکالیں،

ایک بات اس موقع پر صاف کہدینی ہے، ہندو بننے کے لئے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں، لیکن مسلمان بننے کے لئے کچھ جاننے کی ضرورت ہے، ہندویت ایک سلبی حقیقت ہے، اور اسلام ایجابی، اگر ہندو اپنی نسبت کچھ نہ جانے گا تب بھی ہندو ہی رہیگا، لیکن اگر مسلمان اپنی نسبت کچھ نہیں جانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہیگا، اس لئے مذہبی تعلیم کا نقدان ہندو کی ہندوئیت میں خلل انداز نہیں، لیکن مسلمان کے مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا، حتی کہ چند نسلوں کے بعد (خاکم بدہن) مسلمان نام کا مسلمان بھی باقی نہیں رہیگا، اس لئے،

گر گردن است چارۂ مجنوں کنوں کنید

حلقہ بھوانہ ضلع جھنگ (پنجاب) سے جمعیۃ تعلیم الاسلام محمدی کے ناظم پنجاب کے عربی مدرسوں کی حالت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مدارس عربیہ کے موجودہ نظام اور مروجہ عربی نصاب سے بہت بیزار اور متنفر ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے، خاص کر پنجاب کا انگریزی تعلیم یافتہ اور امراء کا طبقہ عربی تعلیم و تعلم سے کوسوں دور بھاگتا اور اسے بیکار و مہمل تصور کرتا ہے (العیاذ باللہ العظیم) اور موجودہ طریق کا اسے سخت بدظن ہے، اور اس کے ساتھ زندقہ و الحاد اور نئے فتنوں کا شباب اور غیر مذاہب کا تبلیغی پروپگنڈا زوروں پر ہو رہا ہے، اس وقت نہایت ہی اشد ضرورت ہے کہ مشاہیر حضرات علماء عظام ہندوستان میں عربی مدارس کے تحفظ و بقاء مستقبل میں استحکام کیلئے موجودہ نصاب تعلیم کو حسب ضرورت ترمیم فرمائیں اور نظام تعلیم کی ترقی و تنظیم کے لئے کوئی بہترین لائحہ عمل تجویز فرمائیں"؛

یہ متن کسی شرح کا محتاج نہیں، کیا ہمارے عربی مدارس کے علماء و مدرسین کسی ایک گزر پر اب بھی جمع ہو کر کچھ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

دار الاقامہ میں طلبہ کی کثرت: کبھی کبھی دار الاقاموں میں لڑکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی تھی کہ مجبوراً ایک کمرے میں دو دو اور تین تین لڑکوں کو ٹھہرانا پڑتا تھا[1]، آٹھویں صدی میں جامع ازہر مصر کے دار الاقامہ میں ۷۵۰ لڑکے رہتے تھے[2]،

دار الاقامہ کے چند قواعد: قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو جو آداب سکھائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں دار الاقامہ میں طلبہ کے لئے کس قسم کے آئین و آداب رائج تھے، مثلاً

(۱) کمسن بچے کسی ولی کے بغیر دار الاقامہ میں نہ رکھے جاتے تھے، (۲) لڑکوں پر دار الاقامہ سے باہر جانے میں پابندیاں عائد تھیں، خصوصاً مشتبہ مقاموں میں جانے کی اجازت نہ تھی، محلوں کے لئے بھی ایسے مقاموں سے گذرنا احتراز کے قابل سمجھا جاتا تھا، (۳) اور نہ دار الاقامہ میں ایسے شہریوں کو آنے دینے کی اجازت تھی، جو تہذیب اور اخلاق میں لوگوں کی نگاہوں سے گرے ہوتے تھے، (۴) استادوں، لڑکوں، اور ملازموں کے علاوہ کسی ایسے شخص کو مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، جس کا مدرسہ سے کوئی تعلق نہ ہو، (۵) شریعت کے احکام کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی، (۶) لڑکوں کے باہمی ملنے جلنے کے آداب اور استادوں سے ملنے جلنے میں ادب اور احترام کے آئین کی پابندی کرائی جاتی تھی،

---

[1] خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۱، [2] ۳۷۲، ص ۳۷۱

دار الاقامہ کے طلبہ کو چند آداب وتہذیب کی تلقین

قاضی ابن جماعہ نے دار الاقامہ میں رہنے والے لڑکوں کو چند تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور اجتماعی آداب اور تہذیب کی تلقین کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لڑکے اور لڑکوں میں کس طور طریق سے رہتے سہتے تھے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں :-

۱- مدرسے اور ان کے اوقاف نہ صرف سکونت اور عیش و آرام کے لئے قائم کئے گئے ہیں، اور نہ خانقاہوں کی طرح محض نماز روزہ کی عبادتوں کے لئے ہیں، بلکہ وہ اس لئے ہیں کہ علم کی تحصیل میں مدد پہنچائیں، لڑکوں کی زندگی کے یہ دن جو مدرسوں اور دار الاقاموں میں بسر ہوتے ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، انھیں ایک لمحہ کے لئے ضائع نہ کرنا چاہئے، اور ان کو ان کے حقیقی اور صحیح مشغلوں میں صرف کرنے پر سب سے زیادہ نگاہ رکھنی چاہئے،

۲- ہر طالب علم کا فرض ہے، کہ وہ مدرسہ اور دار الاقامہ میں علم اور تعلیم میں لگے رہنے والوں سے ربط و ضبط رکھے اور ان سے مفید علمی خدمات کا ذخیرہ بڑھاتا رہے،

۳- دار الاقامہ میں تفریح، دلچسپی، اور خوش گپی کی جو صحبتیں قائم ہو جاتی ہیں، ان سے علحدہ رہکر تحصیل علم میں مصروف رہے،

۴- مدرسہ کے سبقوں اور مذاکروں کی مجلسوں میں پابندی سے شریک رہنا چاہئے، اگر دار الاقامہ میں رہنے والے لڑکے ہی درس اور مذاکرہ کی مجلسوں سے غیر حاضر رہیں گے تو مدرسہ اور دار الاقامہ کے قائم کرنے کا اصل مقصود فوت ہو جائے گا،

۵- مجلسوں اور حلقوں کے معلوم ومتعین وقتوں میں اپنی قیام گاہ کو نہ چھوڑنا چاہئے، اور نہ مجلسوں سے اٹھ کر بار بار اپنے کمرے میں آنا چاہئے، اور نہ ان وقتوں میں باہر کے کسی شخص کو اپنے یہاں مدعو کرنا چاہئے،

۶- رفتار، گفتار، نشست برخاست، اور گفتگو میں آداب وتہذیب ملحوظ رکھے جائیں، چال میں میانہ روی رکھنی چاہئے، پڑھنے اور تکرار کرنے اور بحث اور مباحثہ کرنے میں آواز پست رکھی جائے، اور دروازہ کو کھولنے اور بند کرنے میں یہ احتیاط رکھی جائے کہ زور کی آواز نہ پیدا ہونے پائے، یہ تمام باتیں تہذیب کے خلاف ہیں،

۷- درس کے وقتوں میں کسی مدرس کے حلقہ کے سامنے سے گذرنا نہ چاہئے، تاکہ درس وتدریس میں خلل اندازی نہ ہو،

۸- دار الاقامہ کے دوسرے لڑکوں کو سلام کرنے میں پیشقدمی کرنا چاہئے، ان کی ہمسائگی، ہم جنسی، ہم صحبتی، دینی برادری، اور ہم پیشگی کا لحاظ کرکے ان سے مناسب سلوک کرنا چاہئے، ان کی برائیوں سے بچنا، ان کی لغزشوں کو معاف کرنا، ان کے عیوب کو چھپانا، انکے ناروا سلوک سے چشم پوشی کرنا، اور ان میں کا احسان کرنیوالوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۹- اگر مدرسہ یا دار الاقامہ میں کسی کی بدخلقی اور بدطینتی کی وجہ سے، رنج پہنچے، تو تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ سے علحدہ ہو کر طبیعت میں سکون پیدا کرنا چاہئے، اور اگر پھر تعلقات میں ہمواری پیدا ہو کر حالات سدھر جائیں، تو اس مدرسہ سے منتقل نہ ہونا چاہئے، کیونکہ مدرسہ کو بار بار بدلنا خصوصاً مبتدیوں کے حق میں اچھا نہیں ہوتا ہے،

۱۰- جب مدرسہ کے حجرے میں کسی جگہ سے گذرنا پڑے، تو یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ جوتوں میں سے کوئی چیز چھوٹ کر فرش یا چٹائی پر گرنے نہ پائے، اور نہ جوتے اس طرح ہاتھ میں اٹھائے جائیں، کہ دونوں جوتوں کے تلے باہم ملجائیں، بلکہ دونوں جوتوں کے اوپر کے رخ کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھنا چاہئے، اور جوتے کسی علحدہ مقام پر رکھے جائیں، لیکن مسجد کی چٹائی کے نیچے اس طریقہ سے نہ رکھے جائیں، کہ چٹائی کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو،

۱۱- اوپر کی منزل میں رہنے والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ آہستہ آہستہ چلیں تاکہ تیز چلنے کی وجہ سے نیچے کی منزل والوں کو تکلیف نہ پہونچے،

۱۲- زینہ سے اترنے میں اگر دو آدمی ساتھ ہو جائیں تو ان میں سے چھوٹے کا فرض ہے کہ وہ جلد جلد اتر کر راستہ صاف کر دے، اور جو اوپر رہ گیا ہو اسکی تہذیب کا تقاضا یہ ہوگا، کہ وہ اپنی جگہ اسی سیڑھی پر کھڑا رہے جب پہلا اترنے والا نیچے اتر جائے تو وہ اترنا شروع کرے،

اور اگر نیچے کی سیڑھی پر اوپر جانے کے لئے دو آدمی اکٹھے ہو جائیں، تو چھوٹے کو چاہیے کہ وہ زینہ سے پیچھے ہٹ آئے، اور جب اس سے بڑی عمر کا چڑھنے والا اوپر چڑھ جائے، تو پھر وہ اوپر چڑھے،

۱۳- مدرسہ کے دروازہ یا دہلیز پر بیٹھنا نہ چاہیے، اور نہ کسی راستہ کو گھیر کر کھڑا ہونا چاہیے، تاکہ آنے جانے والوں کو زحمت پیش آئے،

۱۴- مدرسہ کے صحن میں بلاضرورت صرف تفریح یا ورزش یا کسی کے انتظار میں چہل قدمی نہ کرنا چاہیے، چلنے پھرنے کا سلسلہ امکان بھر کم رکھنا چاہیے،

۱۵- لڑکوں کے لئے جو وضو خانے بنے ہوتے ہیں، ان میں گھس پل کر جلدی وضو کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے، اس سے ابتذال ٹپکتا ہے، وضو کے مقام کے خالی ہونے کا انتظار کرنا چاہیے، اور اگر دروازہ بند ہو تو تین مرتبہ کھٹکھٹا کر آہستہ سے کھولنا چاہیے،

۱۶- مدرسہ اور دار الاقامہ کی دیواروں پر پتھر یا کوئلہ سے نشان نہ بنانا چاہیے، اس سے دیوار خراب ہوتی ہے، اور نہ گندے ہاتھ دیواروں میں پونچھنے چاہئیں، اس سے دیوار گندی ہوتی ہے،

۱۷- راہ میں گذرتے ہوئے دروازوں کی درازوں اور پھاٹکوں پر نظر نہ جمانی چاہیے کہ اندر کی چیزیں دکھائی دیں، اور اگر دروازہ کھلا ہو، تو ادھر سے نگاہ پھیر لینی چاہیے، اور اگر اندر سے سلام کی آواز آئے، تو جواب دے کر گذر جانا چاہیے،

۱۸- بلند آواز نہ نکالنی چاہیے، نہ پڑھنے میں اور نہ کسی کو پکارنے میں، تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو خصوصاً نمازیوں کے نماز پڑھتے وقت، اور درس کے حلقوں میں بہت آہستہ بولنا چاہیے، اسی طرح تکرار، مذاکرہ، بحث اور مباحثہ کے موقع پر،

۱۹- اگر مدرسہ جانے کا راستہ کسی کھلی راہ سے ہو تو پورے کپڑے پہن کر جانا چاہیے خاص طور پر سر ننگا رہے،

۲۰- بری عادتوں جیسے راہ چلتے دیکھنا، زوردار قہقہے مارنا، ہر وقت ہزلیات بکتے رہنا، پہلو پر یا چت

لیٹے رہنا، اونگھنا، یا بے وقت سونا، ان سب سے پرہیز کرنا چاہیے،[۵]

مدارس کے کتب خانے

مدرسوں میں منتظمین کی طرف سے کتب خانے قائم کئے جاتے تھے جن سے علماء اور طلبہ استفادہ کرتے تھے، جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ قائم ہوا، تو شاہی کتب خانہ سے ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر چیدہ کتابیں مدرسہ کی عمارت میں منتقل کی گئیں[۶]، اسی طرح الحاکم نے مصر میں دار الحکمۃ کے نام سے ایک دار العلم کھولا تو اس میں وسیع پیمانہ پر کتب خانہ بھی قائم کیا، مقریزی لکھتا ہے:-

"اس دار العلم میں امیر المومنین کے خزانہ سے مختلف فنون اور آداب کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا جس کی مثال آجتک نہیں دیکھی گئی"۔

یہاں ہر شخص کو اگر فائدہ اٹھانے کی عام اجازت دیدی گئی تھی،...... بعض لوگ یہاں کتابوں کے مطالعہ کیلئے آتے، بعض انھیں نقل کرنے کے لئے اور بعض سبق پڑھنے کے لئے کتابیں لیتے تھے،

اس میں لکھنے پڑھنے کی عام ضرورت کی چیزیں، روشنائی، قلم، دوات اور کاغذ بھی لوگوں کے لئے تیار رکھی جاتی تھیں"[۷]۔

اسی طرح دوسرے مدرسوں میں کتب خانوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، جیسے مدرسہ ناصریہ مصر کے متعلق ہے:-

"اس میں اس نے ایک جلیل القدر کتب خانہ قائم کیا"[۸]

مدارس کے شفا خانے

مدرسوں کے لئے اسی کی عمارت کے اندر جداگانہ شفا خانے بھی قائم کئے جاتے تھے، جن میں مدرسہ کے متوسلین علاج و معالجہ کراتے تھے، مدرسہ مستنصریہ کے سلسلۂ عمارات میں اس کے شفا خانہ کے لئے علحدہ عمارت تعمیر کی گئی تھی[۹]،

---

[۵] تذکرۃ السامع از ص ۲۰۹ تا ص ۲۳۶ [۶] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۲۶ [۷] خطط مصر مقریزی جلد ۱ ص ۴۵۹ [۸] جلد ۲ ص ۳۸۲

[۹] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۲۶،

ایوانِ درس

مدرسوں میں درس کے لئے علیحدہ علیحدہ ایوان (ہال) تعمیر کئے جاتے تھے جنھیں موجودہ زمانہ کا کلاس روم کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی تقسیم درجوں کے اعتبار سے نہ تھی، بلکہ ہر استاد کے لئے درس کا ایوان علیحدہ ہوتا تھا، کبھی ایوانِ درس کی دیواروں پر زینت کے لئے اشعار لکھتے تھے،[لہ]

مقاماتِ تدریس

درس کے ہر ایوان میں استاد کے لئے مقامِ تدریس علیحدہ بنایا جاتا تھا، ابن بطوطہ بغداد کے مشہور مدرسہ مستنصریہ کے متعلق لکھتا ہے:

"اس مدرسہ میں چاروں مذہبوں کی تعلیم دیجاتی ہے، ہر مذہب کے لئے مسجد (مدرسہ) میں ایک ایک ایوان اور مقامِ تدریس ہے، مدرس کی نشست لکڑی کے ایک چھوٹے قبہ کے اندر کرسی پر جس پر فرش بچھا ہوتا ہے، ہوتی ہے"[ٹ]

مدرسوں کے عہدہ دار و ملازمین

اسلامی مدرسوں میں حسب ذیل عہدہ دار و ملازمین کا پتہ چل سکا ہے:

۱۔ صدر اساتذہ

۲۔ مرتب مدرسہ

۳۔ اساتذہ

۴۔ معید

۵۔ نقیب

۶۔ خازن

۷۔ دربان

صدر اساتذہ

مدرسوں میں اساتذہ و معلمین کے درمیان فرق مراتب قائم تھا، ہر مدرسہ میں رئیس معلم کے لقب سے ایک صدر اساتذہ ہوتا تھا، جو معلمین کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، ابو اسحٰق شیرازی نظامیہ کے پہلے صدر مدرس تھے، اور سیکی کے بعض صدر اساتذہ کا ذکر تاریخ میں آیا ہے،[ٹ]

لہ وفیات الاعیان جلد اص ۴۳۷، ٹ رحلۃ ابن بطوطہ جلد اص ۱۶۷، ٹ مختصر کتاب انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ در اماری ص ۱۴۳

مرتب مدرسہ

مدرسوں میں مرتب مدرسہ کے لقب سے ایک عہدہ دار ہوتا تھا، جسے شاید موجودہ زمانہ کے مدرسوں کا مہتمم سمجھنا چاہئے، مدرسہ کے انتظامی امور اور نظم و نسق کے مسائل اس سے متعلق رہتے تھے، جیسے شیخ محمد بن محمد بن احمد معروف بہ ہمام مرتب حریوی متوفی ۶۱۶ھ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے مرتب تھے،[لہ]

شیوخ و اساتذہ

ہر مدرسہ میں مختلف علوم و فنون، قرآن، حدیث، تفسیر، کلام، فلسفہ، صرف و نحو وغیرہ کے لئے علیحدہ علیحدہ معلم ہوتے تھے جنھیں شیخ کا لقب حاصل ہوتا تھا، وہ اپنے شعبۂ علم کا نگراں ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت اس کے نائبین ہوتے تھے،

اساتذہ کا لباس،

اساتذہ کا لباس خاص ہوتا تھا، مدرسہ مستنصریہ کے اساتذہ عمامہ باندھتے اور سیاہ عبا پہنتے تھے، درس کے وقت انکے لئے اس لباس میں ملبوس رہنا ضروری تھا، ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"مدرس اس مقام تدریس پر عمامہ باندھے ہوئے، سیاہ لباس پہن کر بیٹھتا ہے جس سے ایک خاص وقار اور حکمت ظاہر ہوتا ہے"[ٹ]

اساتذہ کا انتخاب

اساتذہ کا انتخاب بڑی دیکھ بھال سے کیا جاتا تھا، ملک کے مشہور ارباب فضل ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے جاتے تھے، اور علم و دین کی خدمت کے تخیل کے ساتھ وہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے، مدرسہ کے بانی اگر کسی غیر معمولی صاحبِ فضل و کمال کو کسی گاؤں میں گوشہ نشین پاتے، تو اسے کھینچ کر مدرسہ میں بلا لیتے، مدرسہ نظامیہ کا بانی نظام الملک طوسی کسی ضرورت سے بلخ گیا ہوا تھا، وہاں اسے ایک گاؤں دخش میں ایک صاحب کمال کے عزلت گزین ہونے کی اطلاع ملی، جس نے تحصیل علم میں بڑے بڑے سفر کئے تھے، اور حدیثوں کا قیمتی ذخیرہ سینہ میں محفوظ کر لیا تھا، یہ حافظ امام ابو علی حسن بن علی دخشی تھے، نظام الملک ان کے حالات سنکر ان کا مشتاق ہوا، اور انھیں بلا کر مدرسہ نظامیہ میں حدیث کی مشیخت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور سنن ابوداؤد خود ان سے پڑھی،[ٹ]

لہ الوافی بالوفیات صفدی جلد اص ۱۵۶، ٹ رحلۃ ابن بطوطہ جلد اص ۱۶۷، ٹ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۴، ۲۴۵،

اساتذہ کی معاشی حالت

جیسا کہ اوپر کہا گیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے معلموں کے وظیفے مقرر ہونا شروع ہو گئے، پھر جب مدرسوں کا باقاعدہ نظام جاری ہوا تو ان کی تنخواہیں مقرر ہونے لگیں، مولانا شبلی مرحوم نے انکی بیش قرار تنخواہوں کا تذکرہ اپنے مقالہ میں فرمایا ہے،

لیکن یہ تنخواہیں جس قدر بھی بیش قرار ہوں اس عہد کی عام معاشی فراغ بالی اور ارباب حکومت اور اہل مناصب کی تنخواہوں کے لحاظ سے وہ کم تر تھیں ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں قاضیوں، مفتیوں، خطیبوں اور معلموں کو ایک زمرہ میں شمار کرکے دکھایا ہے کہ یہ لوگ غیر معمولی دولت و ثروت حاصل نہیں کر سکتے، وہ لکھتا ہے:

"اس کا سبب یہ ہے کہ کسب اعمال کی قیمت ہوتا ہے، اور اعمال کی ضرورتوں کے اختلاف کے لحاظ سے ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے، جن کاموں کی تمدنی زندگی میں لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ عوام ان کے زیادہ حاجتمند ہوتے ہیں، لیکن ان کاموں یعنی تدریس اور افتا وغیرہ کے پیشوں کی عام لوگوں کو زیادہ حاجت نہیں، ان کی احتیاج زیادہ تر خواص کو ہوتی ہے، عوام عموماً ان سے مستغنی ہوتے ہیں، حالانکہ اپنی جگہ ان کی ضرورت اور اہمیت شدید ہے اسی لئے حکومت جو معاوضہ کی ذمہ دار ہوتی ہے، وہ ان پیشوں کے فائدوں اور مصلحتوں کا لحاظ کرکے ان پیشوں کا اہتمام خود کرتی ہے، اس لئے ان کی معیشت کے اہتمام کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے، لیکن وہ (بعض دوسرے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کسی دوسری جگہ بیان کی گئی ہے) انھیں بڑے عہدہ داروں کے مساوی معیشت مہیا نہیں کرتی ہے، پھر دوسری طرف ان پیشوں کے لوگ اپنے علم اور فضل کی وجہ سے زیادہ خوددار ہوتے ہیں، اس لئے وہ ذلت نفس اٹھا کر رزق کی طلب کے وہ وسائل اختیار نہیں کرتے جنھیں عام لوگ کام میں لاکر معیشت بہم پہنچاتے ہیں اسلئے وہ لوگ عموماً زیادہ دولتمند نہیں ہوتے ہیں"،

اس کے بعد لکھتا ہے:،

میں نے اپنا یہ نظریہ بعض ارباب فضل سے بیان کیا تھا، لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، حسن اتفاق کہ مجھے مامون کے دفتروں کے بعض حسابوں کے پھٹے ہوئے اوراق ہاتھ آئے، جو بہت سے آمد و خرچ کے حسابوں پر مشتمل تھے، ان کے مطالعہ سے تعجب انگیز طور پر میرے اوپر کے بیان کی تصدیق ہوئی[1]"

البتہ جو اہل علم دوسرے ذرائع سے دولت جمع کر لیتے تھے، اور اپنے ذوق سے خود مدرسے قائم کرتے تھے، ان کی مثال اس سے علٰحدہ ہوگی، جیسا کہ ابن بطوطہ نے بعض شہروں کے علماء اور فضلاء کی دولتمندی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے ماسوا ہر دور میں ایسے اہل علم بھی پائے جاتے تھے، جو اپنی پرہیزگاری کی بنا پر تعلیم کی اجرت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے، اور معاش کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دوسری سبیل نکالتے، اور بقدر ضرورت حاصل کرکے گذر اوقات کرتے، اور تعلیم اور تعلم میں مشغول رہتے، بلکہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تعلیم کا معاوضہ لینے کی ممانعت کی ہے[2]،

معید

ہر ایوان درس میں ایک یا دو "معید" ہوتے تھے، جو استاد کے درس اور املا کا اعادہ کرتے جاتے تھے، ابن بطوطہ اسی سلسلۂ بیان میں کہتا ہے!

"اس (استاد) کے دائیں بائیں دو معید ہوتے ہیں، وہ ہر فقرہ کو جو استاد لکھاتا ہے، دہراتے جاتے ہیں،

درس کی ان چاروں مجلسوں میں سے ہر مجلس میں بھی ترتیب اور نظام قائم ہے[3]"

معید کی حیثیت لڑکوں سے بلند اور استاد سے فروتر ہوتی تھی، حوالہ کی کتابوں کا مراجعہ کرنا بھی اسی کا کام تھا، جیسے ابو اسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی جو آگے چل کر مدرسہ نظامیہ بغداد کے سب سے پہلے صدر معلم نامزد ہوئے، تھے، اپنے استاد ابو الطیب طبری کے درس کے حلقہ میں معید استاد اور بعد میں مدرسہ نظامیہ میں صدر معلم مقرر ہوئے[4]،

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۲ و ۴۳۳ [2] احیاء العلوم کتاب العلم [3] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۰۷ [4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۵

معید کے فرائض اور ذاتی اوصاف میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نیکو کار اور صاحب فضل ہو، اگر کسی وقت لڑکوں کی طرف سے کوئی ناملائم برتاؤ ظاہر ہو، تو صبر اور ضبط کر سکتا ہو، انھیں فائدہ پہنچانے کا خواہاں ہو، اور انجیر اپنے فرائض کی ادائی پر مستعد رہ سکتا ہو، وہ لڑکوں کے ساتھ دارالاقامہ ہی میں مقیم رہے، اور انکی تکرار اور مطالعہ میں جب کوئی دقت پیش آئے اور وہ استاذ کے درس اور املا کو بھول گئے ہوں تو اس وقت بھی وہ اس کے ضروری حصے دہرائے بلکہ قاضی ابن جماعہ کا بیان ہے کہ معید کا نام معید اسی موقع کی مناسبت سے پڑا ہے، کہ وہ خارج وقتوں میں درس کا اعادہ کرتا ہے[۱]،

معید کا منصب دسویں صدی ہجری تک مدرسوں میں باقی تھا، صاحب الشقائق النعمانیہ، مصلح الدین مصطفےٰ معروف بابن البرکی زادہ متوفی ۹۱۹ھ کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہ بعض قاضیوں کی اولاد میں سے تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علماء سے تعلیم حاصل کی، پھر مولیٰ قاسم معروف بہ قاضی زادہ کی خدمت سے وابستہ ہوئے، پھر ان کے درس کے حلقہ کے **معید** قرار پائے، اس کے بعد بعض مدرسوں میں استاذ مقرر ہوئے، پھر سلطان بایزید نے انھیں اپنے لڑکے سلطان احمد کا معلم بنایا، اسکے بعد سلطنت کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک مدرسہ ان کے سپرد کیا گیا[۲]"

نقیب درس درس کے ہر ایوان میں ایک نقیب ہوتا تھا، اس کے لئے ذہین اور موقع شناس ہونا ضروری تھا، وہ مجلس کی مناسب ترتیب قائم رکھتا، حاضرین کو ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھاتا، لڑکوں کو مجلس کے آداب کے برقرار رکھنے اور درس کو توجہ سے سننے اور مجلس کے حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا، غرض وہی مجلس کے جملہ انتظام و انصرام کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا[۳]،

قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:-

"ہر حلقہ کے استاد کے لئے ایک نقیب ضروری ہے، جو ہشیار، تیز اور جری ہو، حاضرین میں ترتیب قائم کر سکے، اور جو لوگ حلقہ میں آئیں انھیں ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھائے، سونے والوں کو بیدار کرے،

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۰۲ [۲] ص ۹۰ [۳] الشقائق النعمانیہ حاشیہ وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۴۳۷ [۴] [۵] تذکرۃ السامع ص ۱۴۱

طالب علموں کو جو کچھ کرنا ہے، اس کے نہ کرنے پر، اور جو نہ کرنا چاہیے اس کے کرنے پر تنبیہ و اشارہ کرے، اور سبقوں کے سننے کی ہدایت کرے، اور سبق کے درمیان خاموشی قائم رکھے[۱]"

خازن اسکی نگرانی میں مدرسہ کا کتب خانہ ہوتا تھا،

دربان اگرچہ درس کے ایوان کا دروازہ ہر صاحب علم و طالب علم کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، تاہم مدرسوں کی دہلیز پر دربان مقرر رہتے تھے، جو درس و تدریس کے وقتوں میں مدرسہ میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتے تھے، اور غیر متعلق اور ضروری اشخاص کو اندر جانے سے روکتے تھے[۲]،

بچوں کے آغاز تعلیم کی عمر اس زمانہ میں بڑی کم عمری کے زمانہ میں بچوں کی تعلیم شروع کرا دیتے تھے، ہندوستان میں ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ دن کی عمر میں بچوں کے مکتب کرنے کا جو رواج ہے، اس کا پتہ مغل سلاطین کے عہد سے چلتا ہے، چنانچہ بابر نے ہمایوں کا مکتب اسی عمر چار سال چار مہینے اور چار روز میں کرایا[۳]، پھر ہمایوں نے اپنے لڑکے اکبر کو بھی اسی عمر میں مکتب کے لئے بٹھایا، اکبر نامہ میں ہے:-

"از ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند حضرت شہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادات آن آموختہ درس گاہ الہی در موزوان و بستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند[۴]"

اگرچہ اس تعیین و تحدید کا ذکر عربی و اسلامی ملکوں کے علما کی طالب علمی کے حالات میں نظر نہیں آیا، مگر ان ملکوں میں بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے تقریباً اسی عمر سے بٹھا دیتے تھے، اور وہ ابتدائی نوشت و خواند سے جلد فرصت پاکر آٹھ دس سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے مختلف علوم کے مبادیات حفظ کر لیتے تھے، اور سن شعور میں داخل ہوتے ہی علوم کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں:-

"میں جب مالک ابن انس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو موطا حفظ کر چکا تھا، انھوں نے مجھے دیکھکر فرمایا کہ کسی کو بلاؤ، جو تمھارے لئے موطا پڑھے، میں نے کہا، میں خود موطا کا قاری ہوں، چنانچہ میں نے بر زبان

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۴۲ [۲] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۶۲ [۳] پرموشن آف محمڈن لٹریچر زبدۃ ناتہ لاص ۱۲ بحوالہ تذکرۃ السلاطین [۴] اکبر نامہ جلد ۱ ص ۲۹۶ نولکشور

ان کے سامنے موطا پڑھی[1]"

خطیب بغدادی کہتے ہیں :-

"میں نے سب سے پہلے گیارہ سال کی عمر میں حدیث سنی، کیونکہ میں یوم شنبہ ۲۴ رجادی الاخری ۳۹۲ھ کو پیدا ہوا، اور میں نے پہلی مرتبہ محرم ۴۰۳ھ میں حدیث پڑھی[2]"

ابو العباس احمد بن یحییٰ معروف بہ ثعلب نحوی کہتا ہے :-

"میں نے عربی زبان اور لغت کی تحصیل ۲۱۶ھ میں شروع کی، اور فرا نحوی کے مسائل پر ۱۸ سال کی عمر میں غور کرنے لگا، اور ۲۵ سال کی عمر تک پہونچکر فرا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو میرے لئے اچھوتا رہ گیا ہو، بلکہ مجھے یاد نہ ہوگیا ہو[3]"

حضرت حسن فرماتے ہیں :-

"بچپن میں علم کی تحصیل پتھر کی لکیر کے مانند ہوتی ہے[4]"

مدت تعلیم وتحصیل طلبہ کی تعلیم کے زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں تھی، اور نہ علم کی تحصیل کے لئے کسی عمر کی قید تھی، زرنوجی کہتا ہے، علم کی تحصیل کا زمانہ مہد (گہوارہ) سے لحد تک ہے، بہرحال جب تک جس کے حالات اجازت دیتے اس زندگی کو قائم رکھتا، چنانچہ اہل علم کے سوانح میں یہ نظر آتا ہے، کہ وہ تعلیم اور تحصیل سے فارغ ہوجانے کے باوجود برسوں استاد کی خدمت میں زندگی گذار دیتے تھے، اور استاذ اور معلم کہے جانے کے بجائے شاگرد اور متعلم کہلانا فخر سمجھتے تھے، لیکن پھر وہ اپنے شیخ کے درس کی مسند سے ایسے بن کر اٹھتے، کہ اس کی وفات پر اس کی جانشینی کرسکتے تھے، مثلاً ابن خلکان کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن وہب مالکی جو مصر میں امام مالک کے جانشین سمجھے گئے، وہ امام مالک کی خدمت میں بیس سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے تھے[5]

[1] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۷۶ [2] ابن عساکر جلد ۱ ص ۲۹۰، [3] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳۰، [4] تعلیم المتعلم ص
[5] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳۱۲،

ابو اسحاق شیرازی جو مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر معلم تھے، اپنے استاذ قاضی ابو الطیب کی مجلس میں دس زیادہ مدت تک مسلسل شریک رہے[1]

حاکم صاحب المستدرک نے شیخ ابو الحسین محمد بن محمد بن یعقوب نیشاپوری متوفی ۳۳۶ھ کی صحبت میں تحصیل تعلم کیلئے ۲۰ سال سے زیادہ گذار دیئے[2]

اسی طرح امام احمد بن حنبل غندر کے متعلق اور ابو الولید طیالسی یحییٰ بن سعید کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں نے شعبہ کی صحبت میں کامل بیس سال گذارے تھے، اور ابو عوانہ نے تو یزید بن زریع کی خدمت میں چالیس سال بسر کردیئے[3]

نیز طلبہ اپنے استادوں اور دوسرے مصنفوں کی خدمت میں ان کی کتابوں کی قرات اور سماع کی سند کے لئے قیام کرتے تھے، اور اس میں بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، ابن مغربی کا بیان ہو کہ میں ابن حزم کیساتھ سات برس تک رہا، اور ان سے انکی تمام تصنیف سنیں[4] تاہم اس کا یہ مقصد نہیں کہ سست رفتاری سے ساری عمر طالب علمی کا سلسلہ قائم رکھتے تھے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، نوجوانی کے زمانہ کو علم کی تحصیل میں پورے انہماک سے صرف کرتے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں، "اپنے فراغت نشاط اور عافیت اور نوجوانی کے زمانہ کو غنیمت جانو....."

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "فقہ کی تحصیل بال سپید ہونے سے پہلے کرلو" امام شافعی فرماتے ہیں "سردار بننے سے پہلے مال کرلو جب سرداری آجائیگی، تو علم حاصل نہ کرسکو گے" پھر لکھتے ہیں :

"لیکن علم کے کمال کے باوجود اپنے کو مشائخ سے مستغنی نہ سمجھو"

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :-

"اپنی جوانی اور عمر کے وقتوں کو تحصیل میں لگانے میں عجلت کرو، کیونکہ عمر کی جو گھڑی گذرتی ہے، اس کا بدل کوئی دوسرا موجود نہیں[5]"

[1] ۱۳ر ۱۰ ص
[1] وفیات الاعیان جلد ۲ ص [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۱ [3] ر جلد ۳ ص ۱۸۳ غندر، ۲۷۷ (سعید) ۲۲۶ (ابو عوانہ) [4] ر ص ۳۲۲ [5] تذکرۃ السامع

جب جب طالب علم کی تعلیم ختم ہوتی تھی، وہ مدرسہ سے رخصت ہوتا تھا، اور لڑکے مختلف ملکوں میں مختلف عمروں میں فارغ ہوتے تھے، جیسے ابن خلدون لکھتا ہے کہ مغرب کے عام شہروں میں مدرسوں میں عموماً ۱۶ سال میں تعلیم ختم کراتے تھے لیکن شہر تونس میں صرف پانچ برس میں لڑکوں کو پڑھا کر تیار کر دیتے تھے،

علماء اور طلبہ کی جسمانی ریاضت

اگرچہ موجودہ زمانہ کی ورزشوں کے نظام کے مثل اسلامی مدرسوں کے نظام و دستور العمل میں کوئی مستقل انتظام نہ تھا، لیکن علماء و طلبہ اپنی جسمانی ریاضت کا خاص اہتمام کرتے تھے، تیر اندازی، اور اسپ سواری ان کی مشہور ورزشیں تھیں،

صحیح بخاری میں اس گھوڑ دوڑ کا ذکر آیا ہے جس کا اہتمام آنحضرت صلعم نے خود فرمایا تھا، اور حضرت عبد اللہ ابن عمر بھی گھوڑے پر سوار تھے، اونٹوں کی دوڑ بھی مشہور ہے، جس میں آنحضرت صلعم کی اونٹنی دوڑی تھی[1] حضرت ابن عون کے متعلق روایت ہے، کہ وہ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے تھے، اور ایک مرتبہ میدان میں گھیر کر گورخر کا شکار کیا تھا،[2] امام شافعی کو تیر اندازی میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ قریش میں کوئی دوسرا شخص ان کے ایسا موجود نہ تھا، وہ ایک ساتھ دس تیروں سے دس نشانے مارتے تھے،[3] امام بخاری اکثر میدان میں گھوڑے پر نکل جاتے، اور تیر اندازی کی مشق کرتے، ان کے متعلق بھی کہا گیا ہے، کہ ان کے تیر کم خطا کرتے تھے،[4] نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی نے علمائے سلف میں "جسمانی ریاضت" کا عنوان قائم کرکے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے،[5]

مدرسوں میں بھی اگرچہ ورزشوں کا انتظام موجودہ زمانہ کے مثل نہ تھا مگر ماہرین تعلیم نے مدرسہ کے لڑکوں کو جسمانی ریاضت میں خاص طور پر چہل قدمی کرنے کا مفید مشورہ دیا ہے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:-

"ٹہلنے اور جسم کی ریاضت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ حرارت برانگیختہ کرتے ہیں، ردی فضلات زائل کرتے ہیں اور بدن میں نشاط پیدا کرتے ہیں"[6]

[1] صحیح بخاری [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۴۰ [3] ایضاً جلد ۱ ص ۳۳۱ [4] مقدمہ فتح الباری ص ۵۶۶ [5] علمائے سلف ص ۱۲۰ و ۱۲۱ طبع دوم [6] تذکرۃ السامع ص ۸۳،

نیز مختلف علماء کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ پابندی سے جسمانی ریاضت کا اہتمام کرتے تھے، ابن بطوطہ مصر کے بعض علماء کے متعلق لکھتا ہے:-

"انہی میں قوام الدین کرمانی ہیں، ان کی سکونت جامع ازہر کی اوپر کی منزل میں ہے، ان کے حلقہ میں فقیہوں اور قاریوں کی ایک جماعت ہے، جو ان سے وابستہ رہتی ہے، اور ان سے مختلف فنون کا درس لیتی ہے، اور فتاوی دیتی ہے، ان کے لباس میں موٹے اور بھدے اون کی ایک عبا، اور سیاہ اونی عمامہ ہے،

"ان کے روزانہ کے معمولات میں یہ داخل ہے، کہ وہ عصر کی نماز کے بعد فرحت بخش مقاموں اور تفریح گاہوں میں اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر تنہا چلے جاتے ہیں"[1]

حقیقت میں اس زمانہ میں لڑکوں اور معلموں کے ذمہ مختلف فرائض اس قدر تھے، کہ ان کی ورزش آپ سے آپ ہو جاتی تھی، اور وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں سے زیادہ صحیح اور تندرست رہتے تھے، انھیں علیحدہ ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ اس زمانہ میں پاپیادہ چلنے کا رواج خاص طور پر علم کی طلب میں بہت زیادہ تھا، لوگ سیکڑوں میل پاپیادہ سفر کر ڈالتے تھے، اسلئے ان کے ٹہلنے اور پیدل چلنے کی مشق جاری رہتی تھی جس کی عادت اس زمانہ کی شہری زندگی میں کم لوگوں کو رہ گئی ہے، اسلئے اگر موجودہ اور پچھلے زمانہ کے لوگوں کی عمر کا اوسط نکالا جائے تو اُس زمانہ کے لوگ بڑی عمروں کے ثابت ہوں گے۔

نزہت گاہوں کی سیر اور دوسرے تفریحی مشاغل

سیر و تفریح کا مدرسوں میں بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، جب لڑکے درس و مطالعہ سے تھک جاتے تو فرصت کے وقتوں میں نزہت گاہوں کی سیر کا مشورہ دیا جاتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"اگر دل و دماغ اور ذہن اور نگاہ تھک جائے، یا کمزوری معلوم ہو تو سیر گاہوں میں سیر اور تفریح کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاکہ پہلی حالت پھر لوٹ آئے"[2]

[1] ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۳۰ [2] تذکرۃ السامع ص ۷۹،

اساتذہ و علما بھی سنجیدہ علمی مشغلوں سے تھک کر تفریح کے لئے دوسرے دلچسپ مشاغل اختیار کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ جب حدیث بیان کرتے کرتے تھک جاتے، تو شاگردوں سے فرماتے، کہ "جاؤ شعرا کے دیوان اٹھا لاؤ"۔[1]

ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابو نصر فارابی اپنے دمشق کے قیام کے زمانہ میں زیادہ تر کسی آبشار کے پاس یا کسی باغ کے چمن میں بیٹھ کر اپنی کتابیں تصنیف کرتا تھا، اور اس کے حاجتمند وہیں جا کر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے[2]، اہل علم کبھی کبھی باغوں میں دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے، مشہور محدث ابن خزیمہ نے ۳۰۹ھ میں باغ میں بڑے پیمانہ پر ایک دعوت دی تھی جس میں شہر کے تمام محدثین اور طلبہ شریک ہوئے تھے،[3]

طریقۂ تادیب

قاضی ابن جماعہ لڑکوں کی سرزنش کا طریقہ یہ بتاتے ہیں، کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی بات تہذیب کے خلاف سرزد ہو تو اس شخص کے سامنے نرمی سے سمجھایا جائے جس کے سامنے بدتہذیبی کی گئی ہو، اگر وہ باز نہ آئے تو پوشیدہ طور پر اسے سمجھایا جائے گر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اسے سخت الفاظ میں علانیہ تنبیہ کیجائے، اور اگر یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئے، تو اس صورت میں اس لڑکے کو علٰحدہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے خصوصاً اگر اس کا اثر دوسرے طالب علموں میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو[4]،

یحییٰ بن محمد بن یحییٰ بن سلام کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی اسد بن فرات درس میں مصروف تھے اور درس کے اثنا میں رویت باری سے متعلق ایک حدیث آئی، شاگردوں کی صف میں سلیمان الفرا جس نے بعد میں سلیمان المعتزلی کے نام سے شہرت حاصل کی، مجلس کے اخیر میں بیٹھا تھا، وہ اس وقت تک بدعتیوں کے عقیدہ و مسلک کا کچھ متاثر ہو چکا تھا، اس نے اس حدیث پر کوئی اعتراض کیا، پھر رویت باری کے عقیدہ سے مجلس میں علانیہ انکار کر بیٹھا، اس کا طرز عمل گستاخانہ تھا، یہ دیکھ کر قاضی اسد سخت برہم ہوئے، اور غیظ و غضب میں اٹھ کر سلیمان کی داڑھی اور گردن پکڑ لی، اور بے تحاشا مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اس کے بعد اپنے درس کے حلقہ سے نکال دیا[5]،

۱؎ تعلیم المتعلم ص ۵۰، ۲؎ وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۰۳، ۳؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۶۳، ۴؎ تذکرۃ السامع ص ۵۹، ۵؎ [illegible] جلد ۲ ص ۲۴۷

قاضی اسد بن فرات کا یہ طرز عمل درحقیقت موجودہ زمانہ کے "رسٹیکیٹ" کے طریقہ کے مانند ہے، کہ یہ نوبت ایسے موقعوں پر پہنچاتی ہے جب کسی طالب علم سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جس کے دوسرے طلبہ میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو، چنانچہ اس موقع پر بھی سلیمان المعتزلی کے رویت باری کے عقیدہ سے انکار کا اثر حلقہ کے دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا تھا، اسلئے جیسا کہ قاضی ابن جماعہ نے کہا ہے کہ اگر اس کا اثر دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا ہو تو اسے مدرسہ سے خارج کر دینا چاہئے، قاضی اسد نے اسی کے مطابق اپنا طرز عمل اختیار کیا، ورنہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں کو عام طور پر پاداش میں سنگین سزائیں دینے کے حامی تھے، جیسا کہ ڈاکٹر ڈانیال ہانے بیرک نے شیخ سعدی کی گلستان کے ایک قصہ اور جرمن سیاح اولیاریوس کے ایران کے ایک مکتب کے مشاہدہ سے قیاس کر کے یہ رائے قائم کی ہے، کہ اسلامی مدرسوں میں لڑکوں کے ساتھ سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ

"اسلامی مکاتب میں بچوں کی محبت کو راہ نہ تھی،"[1]

اسلامی مدارس میں استاذ بچوں کے ساتھ کس قسم کی پدرانہ شفقت سے پیش آتے تھے، اس کا اندازہ آگے چل کر ہوگا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں پر جبر و تشدد کے کئے جانے اور انہیں سخت سزائیں دینے کے سخت مخالف تھے، قاضی ابن جماعہ کا بیان اوپر گذرا، ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:

تعلیم میں سختی طلبہ خصوصاً چھوٹے بچوں کے لئے سخت مضر ہے، طالب علم کی تربیت کا دار و مدار سختی پر ہوگا تو اس کا انبساط و نشاط فنا ہو جائے گا، اور یہ سختی اس میں کاہلی اور سستی پیدا کرے گی، اور سزا سے بچنے کیلئے اس کو جھوٹ اور نفاق، اور مکر و فریب کی طرف مائل ہونا پڑے گا، اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اس کا خلق بن جائیں گی، اور انسانیت کی اجتماعی خصوصیتیں یعنی حمیت اور مدافعت فنا ہو جائیں گی، اور وہ اس میں دوسروں کا محتاج ہو جائے گا،

جس قوم نے اس قسم کے جبر و تشدد کے ساتھ زندگی بسر کی، اس میں تمام بداخلاقیاں پیدا ہو گئیں

۱؎ اسلامی نظام تعلیم ص ۱۴،

یہود کو دیکھو کہ ان کی بداخلاقیاں یعنی ان کی خباثت اور مکاری کس قدر ضرب المثل ہوگئی ہے، اس بنا پر طالب علم کے متعلق معلم کا اور بچے کے متعلق باپ کا فرض یہ ہے، کہ ان کی تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ نہ اختیار کریں، محمد بن ابو زید نے معلموں اور متعلموں کے احکام کے متعلق جو کتاب لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بچوں کے مودب کو بوقت ضرورت تین بید سے زیادہ لگانا سزاوار نہیں،

تعلیم کا بہترین طریقہ وہ ہے جس کی تلقین رشید نے اپنے بیٹے امین کے معلم کو کی تھی، اس نے کہا کہ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی روح اور اپنے دل کا پھل تیرے سپرد اور تیرے ہاتھ کو اس پر دراز اور تیری اطاعت کو اس پر واجب کر دیا ہے، اب امیر المومنین نے تیرا جو درجہ مقرر کیا ہے، اس پر قائم رہ، اس کو قرآن پڑھا، اس سے اشعار کی روایت کروا، اس کو احادیث سکھا، اور ہنسنے کے اوقات کے علاوہ اس کو ہنسی سے روک کوئی وقت ایسا نہ گذرنے پائے، کہ تو اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے لیکن اس کے ساتھ اس کو غمگین نہ کر کہ اس کا ذہن مردہ ہو جائے، اور اس قدر نرمی بھی نہ اختیار کر کہ وہ عیش و فراغ کا خوگر ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو تقرب و تلطف کیساتھ اسکی تربیت کر، لیکن اگر وہ اس سے متاثر نہ ہو تو تو سختی کر سکتا ہے"[1]

امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں طلبہ پر سختی کرنے کی ممانعت کی ہے لکھتے ہیں :۔

"چوتھا فرض جو پیشۂ تعلیم کی باریکیوں میں ہے وہ یہ ہے، کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشارہ اور کنایہ میں جہاں تک ممکن ہو روکا جائے، اور اس کی تصریح نہ کی جائے، اور مہربانی کا طریقہ رکھا جائے، ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے، کیونکہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کر دیتی ہے، اور مخالفت کی جرأت دلاتی ہے، اور اس بداخلاقی پر اصرار کرنے کی حرص پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ اشارہ و کنایہ اچھی طبیعتوں کو اپنے معانی کے سمجھنے اور نکالنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اس کے معنی کا

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۱۹ تا ۵۲۰،

سمجھنا اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے"[1]

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔

"اگر کسی طالب علم سے کوئی بات سرزد ہو تو جھڑک دینے اور سختی کرنے کے بجائے نرمی اور مہربانی سے نصیحت کیجائے، اور اس کا مقصد اس میں حسن تربیت پیدا کرنا، اس کے اخلاق کا سنوارنا، اور اس کی حالت کا درست کرنا ہو، اگر وہ طالب علم اشارہ سے سمجھ سکے، تو تصریح سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ تصریح کئے بغیر نہ سمجھ سکتا ہو تو اسی طریقہ سے سمجھایا جائے، اور بتدریج اس کی تربیت کیجائے، اور اسے اچھی عادتیں سکھائی جائیں، اور عمدہ اخلاق اختیار کرنے کا شوق دلایا جائے، اور شرعی طریقہ پر اسے اچھی باتوں کے اختیار کرنے کی تلقین کیجائے"[2]

سالانہ امتحان اسلامی ملکوں کے مدرسوں میں سالانہ امتحان کا طریقہ رائج تھا یا نہیں، اسکی تصریح نظر سے نہیں گذری، البتہ ہندوستان میں بیجاپور میں عادل شاہ نے نظام تعلیم کے چند اصول و قواعد بنائے تھے، جن میں طالب علموں کے سالانہ امتحان کے لئے جانے اور انھیں انعامات دیئے جانے کی تصریح موجود ہے،

"وہر سال امتحان می شد و از انعام ہمون سرفرازی فرمودند"[3]

تعطیل اسلامی مدرسے موجودہ زمانہ کے برخلاف ہفتہ میں ایک دن کے بجائے سہ شنبہ اور جمعہ کو دو دن بند کئے جاتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں لڑکوں کے ذمہ کتابوں کے نسخ کرنے کی ذمہ داری بھی تھی، اسلئے وہ ان تعطیل کے دنوں میں اس کام کو کرتے، قاضی ابن جماعہ ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"اگر طالب علم سے یہ روزانہ انجام نہ پا سکے تو چھوٹے ہوئے کاموں کو سہ شنبہ اور جمعہ کی رات میں کریں"[4]

(کیونکہ ان دونوں راتوں میں درس کے لئے مطالعہ نہیں کرنا ہوتا)

صاحب الشقائق النعمانیہ اس سے زیادہ واضح طور پر ایک سلسلۂ بیان میں لکھتا ہے :۔

[1] احیاء العلوم جلد اکتاب العلم، باب اداب المعلم والمتعلم، [2] تذکرۃ السامع ص ۵۰، [3] بساتین السلاطین ص ۳۵۱، [4] تذکرۃ السامع ص ۳۵۱

"اور ان کے حالات میں یہ بھی ہے، کہ ان کے زمانہ تک لڑکوں کو منگل اور جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی، مولی موصوف نے دوشنبہ کا دن بھی اس میں بڑھا دیا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علامہ تفتازانی کی کتابوں کو شہرت حاصل ہوئی، اور لڑکے ان کے پڑھنے کے مشتاق ہوئے، اور یہ کتابیں قیمت سے بھی دستیاب نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ ان کے نسخے زیادہ شائع نہیں ہوئے تھے، اس لئے وہ ان کے لکھنے پر مجبور ہوئے، اور جب لکھنے کے وقت میں تنگی دکھائی دی تو مولی موصوف نے تعطیل کے دنوں میں دوشنبہ کا اضافہ کر دیا"[1]

موسمی تعطیلات اسلامی مدرسوں میں تہواروں کے علاوہ موجودہ زمانہ کی طرح موسمی تعطیلات کا رواج تھا یا نہیں اسکی تعیین دشوار ہے، تاہم بعض مستشرقین کا نفی میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، قاضی ابن جماعہ کا یہ بیان اس سلسلہ میں غور کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"بعض بڑے علماء اپنے شاگردوں کے ساتھ سال کے بعض حصوں میں تفریح کے بعض مقامات میں جاتے تھے، اور وہاں تفریح حاصل کرتے تھے"[2]

اور قاضی ابن جماعہ نے سخت گرمی اور جاڑے کے وقت درس وتدریس کی ممانعت کی ہے،[3]

(باقی)

---

[1] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ ابن خلکان جلد ا ص ۳۰-۳۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۲۰۲ [3] ر ص ۳۳،

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے درسوں اور تعلیم گاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا، مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، دارالمصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت ۱۲ر "منیجر"

امالی ابی علی القالی

اور

اللآلی

مولینا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

اسلامی علوم کی تدوین مسلمانوں کے یہاں ہر قسم کے علوم وفنون کا سلسلہ دوسری صدی میں شروع ہو کر تیسری صدی کے اوائل میں پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا، چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو، معانی و بیان، لغت وادبیات، فلسفہ، طب، ریاضی وہندسہ وغیرہ تمام فنون میں ہر قسم کی تالیفات اس کثرت سے تیار ہو چکی تھیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں،

تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی میں ماہرین وفضلا، فنون کی تکمیل وتزئین میں مصروف ہو چکے تھے، ہر ایک علم وفن کے متعلق، بلکہ ہر ایک موضوع و جزئیات فن پر سیر کن بحث کرنے کے واسطے پورا پورا سامان تیار ہو چکا تھا، جگہ جگہ عظیم الشان ذخیرے علوم وفنون کے جمع کئے گئے تھے، بالخصوص بغداد، نیشاپور اور اندلس ہر قسم کی تحقیقات کے مرکز بن چکے تھے، اس طرح علوم دینیہ ادبیہ، حکمیہ، صنائع و حرف پر نہایت وسیع اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئی تھیں،

پانچویں چھٹی صدی میں ان متقدمین کے خوشہ چیں فضلا، وعلماء نے بطور تحشیہ وتزئین اختصار یا تشریح کے واسطے تالیفات تیار کیں، اس طرح یہ بے مثل علمی سرمایہ کا سلسلہ ختم ہوا اور خوب ہوا!

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

املاء کا طریقہ

اس زمانہ میں تالیف کے لئے یہ ضرورت نہ تھی کہ استاد قلم و دوات اور کتابوں کا ڈھیر لیکر کوئی کتاب تیار کرے، بلکہ علم بسینہ تھا، اور ہر ایک تالیف کے لئے چندے غور و تدبر کے بعد برجستہ قلم اٹھایا جاتا تھا، یہ بھی ایک خاص صورت تھی، کہ استاد اپنے درس کو باقاعدہ تیار کرکے لاتا، اور طلبہ کے سامنے بطور لکچر درس دیتا، طلبہ لکھتے رہتے، جب ایک حصہ یا ایک موضوع ختم ہو جاتا تو یہی اوس کی تالیف بن جاتی، اس پر نظر ثانی کی جاتی، اور یہی تمام علما، اور فضلا، میں رائج ہو جاتی، اس کا عام چرچا حسب حیثیت ہوتا،!

کبھی خاص خاص دنوں میں یہ طریقہ انجام پاتا تھا، بعض فضلا، متفرق علوم و فنون کے لئے الگ الگ دن مقرر کرتے تھے، اس طرح طلبہ کو مستفید ہونے کا خوب موقع ملتا تھا، اور تعلیم ان کے ذہنوں میں خوب اثر کرتی تھی،

اس مخصوص طریق درس کو "امالی" کہتے ہیں، یہ املا کی جمع ہے،!

تفسیر حدیث، فقہ، ادب، اور نحو وغیرہ میں اس طریقۂ درس کا گو پتہ چلتا ہے، مگر ادبی دنیا میں اس کی بیحد کثرت ہے،!

وجہ یہ ہے کہ بازار خوش کن اور خیالی باتوں سے ہمیشہ زیادہ مانوس رہتا ہے، دنیا میں جب غور و فکر کروگے، فضولیات اور خرافات کی کثرت پر تعجب ہوگا، لوگوں کا مذاق ہمیشہ سے اسی طرح فاسد رہا، اور رہے گا،؟

آج ذرا غور کیجئے، بازار جائیے کتب فروشوں اور مطابع کی سیر کیجئے، اخبار اور رسائل کے دفاتر پر پہونچئے، ہر جگہ عامیانہ خیالات، بیہودہ تالیفات، اور لغویات کا انبار نظر آئے گا یہی چیز تجارت میں چلتی ہی، اور اسی کی قدر تاجر کرتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی علمی مقصد کبھی نہیں رہا، علمی تالیف، مفید اور ضروری مضامین کمیاب، ان کی طرف رغبت کالعدم ہے، سچ ہے قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث

مصر کو لیجئے جسقدر ناول، ڈرامے اور فسانے اس نے شائع کئے، اور آئے دن ترجمہ کرکے شائع کئے جاتے ہیں، ان کے مقابل علمی مطبوعات یا تراجم عشر عشیر بلکہ کبریت احمر ہیں یہی حال ہندوستان وغیرہ کا ہے،!!

ادب عربی کے عناصر اربعہ

ابن خلدون کا یہ مشورہ منقولہ ہے "ہمارے استاذان ادب اپنے درس میں کہا کرتے تھے، کہ جسے فن ادب عربی سیکھنا ہوا سے یہ چار کتابیں جو اس فن کی اصل اصول ہیں پوری طرح یادداشت میں رکھنی چاہئیں،

۱- البیان والتبیین للجاحظ ۲- الکامل للمبرد

۳- الامالی لابی علی القالی، ۴- ادب الکتاب لابن قتیبہ

البیان والتبیین کے تین نسخے مصر سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے، ایک مختصر بھی قسطنطنیہ سے نکلا، مگر اب تک اس کی پوری خدمت نہ ہوسکی، نسخہ بہت غلط اور حل طلب ہے، فہرست اور انڈکس کی الگ ضرورت ہے،!

سچ پوچھئے تو ادب عربی میں ایسی لطیف' دلچسپ اور بلاغت و بیان کے مطالب و مسائل کی جامع کوئی کتاب نہیں معلوم ہوتی، ہونا بھی ایسا ہی چاہئے، جاحظ جیسے علامہ و فاضل نے عبدالملک بن الزیات جیسے وزیر فاضل و بلیغ کے لئے اسے مرتب کیا تھا، اس میں جو کچھ احتیاط ہو کم ہے،!

کامل اور ادب الکتاب کے کئی نسخے مصر و یورپ سے شائع ہوچکے، اور کئی شرحیں بھی طبع ہو چکی ہیں،

ابو علی قالی کی امالی

الامالی کا نسخہ سنہ ۱۳۲۲ھ میں پہلی بار شائع ہوا تھا، پھر دوبارہ خاص اہتمام سے سنہ ۱۳۴۴ھ میں کتاب التنبیہ جو امالی کے اغلاط پر ابو عبید بکری کی تالیف ہی، اور متفرق قسم کے انڈکس کے ساتھ شائع ہوا اگرچہ

لغات کا انڈکس نہیں دیا گیا، جو بہت بڑی خامی ہے تاہم فی الجملہ بہت سی قسم کی فہرستیں طبع ہوچکیں ہیں یہ مضمون دراصل اسی کتاب کے متعلق ہے،

ابوعلی قالی

امالی کے مولف ابوعلی اسمٰعیل بن القسم القالی مشرق کے وہ مایۂ ناز ادیب و لغوی ہیں، کہ امیر عبدالرحمن الناصر الاموی، والی اندلس (جس نے اپنا لقب پہلے پہل امیر المومنین رکھا تھا) نے بڑی رغبت اور شوق سے انھیں مغرب بلایا، یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ علم و فن کی ڈگری مشرق سے حاصل کرنا غایت کمال سمجھتے تھے، جس طرح آج ہر ایک علم و فضل یہانتک کہ حدیث و فقہ و ادب عربی اور تاریخ اسلام بلکہ غالباً اسلام کے لئے یورپ کی سند ہر جگہ مطلوب اور قابل قبول ہے، کچھ عجب نہیں کہ چند دنوں کے بعد نفس ایمان و اسلام کی سند کے لئے بھی ان شیدایان مغرب کو وہاں کا طواف و زیارت فرض سمجھنا پڑے گا، اور اس طرح حقائق کا استحالہ، اور قلب ماہیت پوری طرح ہوجائے گی، تلک الایام نداولہا بین الناس!

القالی کا مغرب میں بڑے زور و شور سے استقبال کیا گیا، انھیں اندلس کے بادشاہ حکم کے ولی عہد المستنصر کے خاص اتالیقوں میں شامل کیا گیا!

یہ وہ زمانہ تھا کہ اندلس اپنے تمدن و شان میں بغداد کا مقابلہ کررہا تھا، اسکی دولت و سطوت انتہائے عروج و کمال پر پہونچ چکی تھی، بادشاہ کو ارباب فن و کمال سے الفت نہیں خاص شیفتگی تھی، ہر طرف سے تمام اکناف و اقطار عالم سے منتخب لوگ بلائے جاتے، ان کی تالیفات جمع کیجاتیں، ان کی ہر طرح سے خاطر و مدارات کیجاتی تھی،

قالی کے لئے یہ فخر کچھ کم نہیں کہ اندلس کے بڑے بڑے متبحر علما، و فضلاء ان کے شاگردوں میں شامل ہوگئے، ان سے استفادہ کرنا باعث فخر سمجھا، مثلاً ابوبکر محمد بن الحسن الزبیدی وغیرہ،

غور کرنے کے بعد القالی کا علمی سرمایہ لغت اور غریب کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا،

الامالی کا نسخہ قرطبہ کی جامع مسجد میں جمعرات کے لیکچروں کا مجموعہ ہے تقریباً ایک صدی یا کچھ کم و بیش

علما میں اس کا چرچا رہا، پھر یہ بھی دوسری علمی کتابوں کی طرح کسی کتب خانہ کی زینت بن گئی تا آنکہ مطبع نے اسے پبلک سے روشناس کیا، کبھی کبھی کسی بڑے فاضل یا کتب بین کے سامنے بھی اتفاقاً پہونچ گئی ہوگی،

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتاب خود کسقدر نادر اور اسکی صحت کے واسطے کسقدر محنت درکار ہوگی کیونکہ جب عام اشاعت نہیں ہوتی، ذوق بدل جاتا ہو تو کتاب صحیح حالت میں مشکل باقی رہتی ہو، پھر کاتبوں کی اصلاح و تحریف ضرب المثل ہے،

مولف کی ولادت ۲۸۸ھ میں ہوئی، یہ دیار بکر میں پیدا ہوئے، راستہ میں قالیقلا ہوتے ہوئے بغداد پہونچے، یہاں القالی سے مشہور ہوگئے، کم و بیش ۲۵ برس تک بغداد میں اقامت کرکے علوم و فنون خصوصاً لغت ادب اور نحو وغیرہ ائمۂ فن سے حاصل کئے، ان کے مشاہیر استادوں میں ابن درید الازدی المتوفی ۳۲۱ھ، نفطویہ وغیرہ ہیں، یہ ابن درید کے پاس ان کی وفات تک رہے، اور ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں،

جو علم بغداد سے لیا اس کے واسطے قرطبہ کا میدان انھیں خوب ملا، وہاں ان کی خوب قدر ہوئی، انھوں نے بڑے اہتمام و عظمت سے اپنے ذخیرہ کو شائع کیا،

جب بغداد سے اندلس کے لئے چلے، تو راستہ میں قیروان پر گذر ہوا، جوں جوں بغداد سے فاصلہ ہوتا گیا افریقیہ کا حصہ طے کرتے گئے، تو انھیں وہاں یہ خیال پیدا ہوا، اگر فاصلہ کے لحاظ سے اندلس اسی قدر پست ہوا جو میں دیکھ رہا ہوں، تو مجھے وہاں اپنی بات سمجھانے کے واسطے مترجم کی ضرورت ہوگی، لیکن قرطبہ پہنچکر انھیں وہاں کے لوگوں کے ذکا، و فہم و فضل و علم پر بہت تعجب ہوا،

ابن بسام کا مقولہ ہے، کہ قالی بحث و مناظرہ میں طرح دیجاتے، اور کہا کرتے تھے، کہ میں نہ روایت کا دھنی ہوں، نہ درایت کا، مجھ سے علم روایہ حاصل کرو، میں پوری صحت و اتقان سے علوم لغت و ادب تمھیں پہونچاؤنگا،

قرطبہ میں سنہ ۳۵۶ھ میں وفات پائی، اور وہیں دفن ہوئے،

تصانیف امالی کے علاوہ ان کی ایک بڑی کتاب لغت میں "البارع" ہے، جس میں جمہرہ اور کتاب العین وغیرہ جمع کی ہیں،

"المقصور والممدود" کا نسخہ انہوں نے جو مرتب کیا بہت جامع اور قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے، مگر افسوس کہ ابتک ہمارے پاس ان میں سے کچھ نہیں ہے، اسلئے ان پر کوئی رائے نہیں لکھ سکتے،

امالی الامالی میں بعض مشکلات قرآن مجید، حدیث شریف اور اشعار واخبار ونوادر مذکور ہیں اور ان کا حل بھی جابجا مؤلف نے کیا ہے، بعض موادِ لغت پوری تفصیل سے لکھے ہین، اس کے علاوہ مؤلف نے جو خاص بات اپنے خطبہ میں لکھی ہے، اس پر ذرا تفصیلی نظر ہونی چاہئے، مؤلف نے لکھا ہے، کہ میں نے ابدال (وہ حرف جو دوسرے کی جگہ عموماً بے قاعدہ اور کبھی باقاعدہ بدل جائے، جیسے لازم، لازب، رفل، رفن، انل، اتن وغیرہ) کی بحث کو اس قدر استقصاء سے لکھا ہے کہ کسی دوسرے نے نہیں لکھا، "مالم یؤثرہ احد"

اسی طرح اتباع (یعنی تابع خواہ مہمل ہو یا بامعنی مثلاً حسن بسن، شیطان لیطان، وغیرہ) جسے اردو میں عموماً تابع مہمل کہتے ہین) کو اسقدر جمع کیا ہے، کہ کسی نے نہیں کیا، "مالم یقیدہ بشر"،

ہرچند امام ابوعبید البکری شارح امالی نے مولف کے اغلاط پر کافی بحث وتمحیص کی ہے، مگر نہ معلوم اس جگہ کوئی مفید جملہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا، حالانکہ ان کے پاس اعلی درجہ کی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا ممکن ہے اسطرف توجہ ہی نہ کی ہو یا اس سے چشم پوشی کر لی ہو،

ہر شخص کا ذاتی احترام کرتے ہوئے ہر ایک ذی علم کا فرض ہے، کہ حقیقتِ حال پیش کردے، علم کی منزلت سب سے فوق اور حق سب سے اعلی ہے،

ہمارے پاس اس فن کی کتابوں کی قلت معلوم ہے، پھر بھی اسوقت ایک کتاب "القلب والابدال" کے نام سے ابن السکیت المتوفی سنہ ۲۴۴ھ کی مطبوعہ بیروت سنہ ۱۹۰۳ء ہمارے سامنے ہے، اس سے جا بجا مقابلہ

کرنے کے بعد صاف معلوم ہوگیا کہ قالی نے اس کتاب کی تلخیص کی ہے، اور بہت سے لغات ومفید شروح ترک کردیے ہیں زیادہ نہیں بلکہ اس سے بہت کم ہے،

اتباع میں ایک رسالہ ابوالحسین بن فارس المتوفی سنہ ۳۹۵ھ کا یورپ میں طبع ہوا تھا، جسکی نقل موجود ہے مقابلہ نہیں کیا گیا، مگر وہاں اس سے کسی طرح کم نہیں، کافی مقدار ہوگی، شرح کے علاوہ وہ حروف ہجا پر مرتب ہے، یہ سہولت اس میں الگ ہے،

الغرض مؤلف کے یہ دونوں دعوے اپنی جگہ پر مسلم نہیں معلوم ہوتے، واللہ اعلم،

شرح امالی امالی کی خدمت ابوعبید البکری عبداللہ بن عبدالعزیز الاندلسی المتوفی فی حدود سنہ ۴۸۷ھ نے خوب کی بہت بلند پایہ علمی شرح لکھی جسکا نام اللآلی رکھا، پھر اس سے مولف کے اغلاط الگ کرکے ایک کتاب "التنبیہ علی اغلاط القالی فی امالیہ" لکھی، اس کا بہترین نسخہ الامالی کے ساتھ سنہ ۱۳۴۴ھ ہجری میں مصر سے شائع ہوچکا ہے،

ابوعبید اللہ البکری کے علم وفضل کی نسبت علماء یک زبان ہیں، مگر انکی تالیفات سے جو صحیح رائے اس کے بارہ میں قائم ہوسکتی ہے وہ یہ ہو کہ نہایت ذکی، وسیع العلم، سلیم الطبع، نقاد ومحقق شخص تھا انساب جغرافیہ اشعار عرب کے مشکلات ومطالب پر پوری نظر تھی، اس اعتبار سے انکی یہ شرح ایک بڑا علمی خزانہ ہے،

البکری کی معجم ما استعجم اور غالباً المسالک والممالک یا اس کا کوئی حصہ یورپ میں عرصہ ہوا شائع ہوچکا ہے، معجم اشعار عرب کے مقامات کے لئے بہترین کلید ہے، اور یاقوت کی طویل وعریض کتاب سے اس بارہ میں زیادہ مفید ہے،

مولانا عبدالعزیز المیمن ہمارے پرانے دوست مولوی فاضل مولوی عبدالعزیز المیمن مبارکباد کے قابل ہیں، کہ

---

۵ تعجب ہے کہ فاضل میمنی نے آٹھ برس کی طویل محنت ومقابلہ وتحقیق میں اس قسم کے علمی معاملہ کو پس پشت ڈالدیا نہ اس طرف انکا ذہن منتقل ہوا حالانکہ اتباع کا نسخہ وہ مجھ سے نقل کرچکے ہیں،

اللآلی کا نسخہ بڑی محنت سے آٹھ برس کی مدت میں تیار کر کے مصر پہونچکر خود شائع کرایا، اس کے واسطے سیکڑوں کتابیں چھان ماریں، اور ہر جگہ سے اخذ کر کے ایک طویل و عریض حاشیہ السمط کے نام سے لکھا جس میں اشعار کی تخریج بڑی محنت سے کی، اور کتاب کے مشکلات پر کافی بحث و تحقیق کر کے مطالعہ کرنے والے کے لئے میدان صاف کر دیا،

اس وقت مجھے اپنے دوست کے اسی کارنامہ پر تبصرہ کرنا مقصود ہے،

میمن صاحب نے مقدمہ کے ص ن پر الاستاذ الامام الشیخ محمد طیب المکی (طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ) کی بابت بیساختہ یہ لکھدیا، کہ انھوں نے اللآلی کا نسخہ مکہ مکرمہ میں دیکھا، مگر اپنے عام شیوہ کے مطابق نہ خریدا،

شیخ مرحوم سے میمن صاحب نے صرف منطق کے چند سبق پڑھے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا، کہ "فرغب عنھا وزھد فیھا علی عادتہ" کے جملوں سے کونسا علمی افادہ مقصود ہے، میرے نزدیک اس سے ایک بڑی جلیل القدر استاذ کی توہین ہوتی ہے،

کیا جو کتاب فروخت ہو رہی ہو اسے ہر حال میں خریدنا ضروری ہے، یا اگر ایک شخص اپنے مذاق کے مطابق کسی کتاب سے ضروری نوٹ لیلے تو اس پر کتاب نہ خریدنے کا اعتراض ہو سکتا ہے،

اللآلی کا نسخہ میمن صاحب کی نگرانی میں شائع ہوا، اس لئے کافی صحت و اہتمام سے نکلا ہے، زیادہ محنت جو فاضل میمن نے کی ہے، وہ اشعار کے ان مقامات کا حوالہ ہے، جہاں وہ کسی طرح لکھے گئے ہیں، اس کے واسطے بہت مشقت اٹھانی پڑی ہوگی، اگرچہ ایک شعر کا کئی جگہ ہونا اسکی علمی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا، البتہ دیوان کا حوالہ یا اصل ماخذ کا حوالہ کافی تھا، اس طرز تخریج کے واسطے میرے نزدیک یہ بہتر ہوگا، کہ "اطراف الاحادیث" کی طرح ایک مجموعہ اطراف الاشعار کا بنا دیا جائے، جس کے بعد ہمیشہ کیلئے یہ مرحلہ ختم ہو جائے اور اس قدر پریشانی اٹھانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے،

البکری نے جو قالی پر اعتراضات کئے ہیں ان کی بابت فاضل میمن صاحب اس طرح ریویو کرتے ہیں:-

"قالی کے اغلاط پر بکری کے تنبیہات بہت شہرت رکھتے ہیں، مگر بے نتیجہ جیسا کہ کہا جاتا ہے چکی کا زور و شور بہت سنتا ہوں مگر آٹا ندارد،

اکثر اغلاط کا اثر محض ابو علی کے اساتذہ پر پڑتا ہے، یا وہ اغلاط ہی نہیں ہیں، بلکہ مختلف روایات ہیں، مگر ابو عبید بکری نے ناپسند کر کے ان پر شور بپا کیا ہے، پھر آگے لکھتے ہیں،:-

جس قسم کی غلطیاں ابو علی قالی نے کیں، اسی قسم کی خود بکری نے بھی کی ہیں" (ص س)

بلکہ بکری نے فاحش اغلاط کئے ہیں" (ص ع)

اس طرح فاضل میمن صاحب ابو علی کے پرزور حامی اور معاون و ناصر ہو گئے، آخر میں لکھتے ہیں:-

"میں نے ہر ایک بات کی صفائی کی ہے، "محصت عن کل ما اتی بہ" یہ عبارت غلط ہے صحیح محصت کل ما اتی بہ مگر بڑائی کی تشہیر یا بدنامی کا شور بپا نہیں کیا، البتہ جہاں ابو علی قالی کی طرف سے بدلہ لینے کی ضرورت ہوئی ہے، وہاں ایسا کیا ہے" (ص ع)

کاش میمن صاحب اپنا فرض کتابوں سے مقابلہ انجام دیکر سکوت فرماتے، اور یہ مرحلہ ان لوگوں کے واسطے چھوڑ دیتے، جو اس میدان کے شہسوار ہیں،

دراصل یہ میدان نہایت مشکل، پُرخطر اور بہت بڑی عقل و تمیز، طبع وقاد و فکر نقاد کا محتاج ہے، ایسا نہ ہو کہ دو کے درمیان اپنے آپ کو ڈال کر ہمیشہ کے لئے راحت سے محروم ہو جائے،

اگر البکری نے ابو علی کے اغلاط پکڑے، بالفرض محال مان لیجئے کہ وہ اس کے نہیں اس کے استادوں کے ہیں، یا زید و عمرو کے، غرض اغلاط تھے، یہی کافی ہے، ابو علی نے انہیں نقل کر کے سکوت کیوں کیا "احد الکاذبین" کی صورت سے کسی طرح الگ نہیں ہو سکتا، اس تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں، کہ دراصل یہ اغلاط کس کے ہیں، یا کیوں واقع ہوئے، اسے تلاش کرنے والے خود تلاش کر لیں گے، حقیقت تلاش کرنے والے کے لئے صرف "غلط

ہونا ہر طرح سے کافی ووافی ہے،

بطور مثال فاضل میمنی صاحب کی یہ نقل ملاحظہ ہو، لست ابالی حین اقتل مسلماً کی بابت لکھا ہے لعبیدۃ بن الحرث الھاشمی قتل مع حمزۃ یوم احد مما اتفق لفظہ واختلف معناہ ص۲۵۔ یہ الاضداد ابن الانباری سے نقل کیا ہے اس نقل میں دو غلطیاں ہیں،

ایک یہ کہ شعر لستُ اُبالی حین اُقتَل مُسلِماً، کو عبیدہ کا بتایا حالانکہ یہ غیر معروف ہے،

دوم اصلی غلطی یہ ہے کہ عبیدۃ بن الحرث کو احد میں مقتول بتایا، حالانکہ جمہور اہل مغازی وسیر کے نزدیک بلا کسی شک وشبہہ کے عبیدہ بدر میں زخمی ہو کر راستہ میں بمقام صفرا انتقال کر گئے، وہ اب زندہ کب تھے جو احد میں حمزہ کے ساتھ قتل ہوئے، یہ ابن الانباری کی غلطی ہے، پھر اسے نقل کرنا، فاضل میمن صاحب کی غلطی ہے پس یہ غلط در غلط معاملہ ہو گیا،

ایک جگہ میمن صاحب نے "ابوالعلاء وما الیہ" میں ابو عمر زاہد کی بابت کسی جگہ سے اخذ کیا ہے، کہ سوحفظ کی وجہ سے متہم کئے جاتے تھے، مگر اس کا حوالہ نہیں دیا، یہ بالکل بے معنی اور بے دلیل بات ہے، کثرت حفظ وسیلان ذہن کی وجہ سے لوگ ان پر وضع لغات کا شبہہ کرتے تھے، کجا سوحفظ اور کجا کثرت حفظ،

اذا طریق الغنصلین فیا منت ۔۔۔ بہ العیس فی نائی الصوی متشائم

ان الفرزدق اذ یعوذ بخالہ ۔۔۔ مثل الذلیل یعوذ تحت القرمل

یہ کہنا کہ اساتذہ ابی علی کے اغلاط سے ابو علی کی غلطی نہیں ثابت ہوتی، بعینہ اسی طرح ہوگا، کہ کوئی سید بدر الدین علوی صاحب استاذ جامعہ علی گڈھ اپنی "شرح مختار اشعار بشار" کے غلط سلط حواشی کو یہ کہہ کر ٹال دیں، کہ "یہ میرے نہیں، بلکہ جناب المیمنی صاحب کے عنایات والطاف ہیں،" یہ کہنا کوئی صحیح عذر نہیں ہو سکتا، غلطی کی ذمہ داری سے نہ وہ اور نہ خود میمن صاحب بچ سکتے ہیں،

فاضل میمن صاحب اپنے لئے "العاجز الغریب" کا لفظ بہت پسند کرتے ہیں، حالانکہ عجز سے شرع نے

پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، اور غربت معلوم نہیں ہندی محاورہ کے مطابق وہ بہت غریب یعنی فقیر ہیں جسے ہندی میں غریب کہا جاتا ہے،

کتاب کی غلطیاں محشی نے یہ کتاب گو بڑی محنت سے لکھی ہے، تاہم یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، کہ وہ اپنی کتاب میں تحریف وتصحیف وتغلیط وتردید کے بکثرت مرتکب ہوئے ہیں، چنانچہ بطور نمونہ چند اغلاط درج کئے جاتے ہیں،

۱۔ ص ۵ پر اصل کتاب میں ایک لونڈی کے گانے کا ذکر ہے، پھر دوبارہ لفظ "جاریۃ" آیا ہے، تو اسے "الجاریۃ" کی ہے، جو عام دستور ہے، اس پر فاضل میمن صاحب لکھتے ہیں، "کذا بدل وجاریۃ" ایسا معمولی استعمال کیوں فراموش ہو گیا، جسکی وجہ سے حاشیہ کی ضرورت ہوئی،

۲۔ اظرف قریش وانما ھامت[۳] اصل کتاب میں "افتاہا" تھا اسے تحریف کر کے "فتاہا" بنایا، اور حاشیہ پر لکھا، "الھیجی افعل من الفتی" مگر اسکی دلیل نحو ولغت وغیرہ سے نہ دی، تعجب بالائے تعجب ہے کہ میمن صاحب نے لغات، وہ بھی لغاتِ عرب کو اپنا خاص مملوکہ مکان خیال کر لیا ہے، یا اسے اپنا مفتوحہ علاقہ سمجھ لیا ہے، کہ جسے چاہیں قبول کریں جسے چاہیں رد کریں، اگر ان کا یہ دعوی صحیح ہے، کہ "فتی" سے "افتی" نہیں آتا، تو اسکی دلیل پیش کریں ورنہ یہ سمجھ رکھیں، کہ یہ محض بے دلیل دعوی ہے،

یقولون اقوالاً ولا علم عندھم ۔۔۔ ونحن قلنا حققوا لم یحققوا

۳۔ رُدّہ ص ۷۶، ۸۴ وغیرہ مؤلف کتاب "ردّ" بکثرت ایک مضمون کو دوبارہ لانے میں استعمال کرتا ہے، "پھر میمن صاحب جابجا بطور اعتراض لکھتے ہیں" "ردّ" کی جگہ "ردّہ" ہے، نہ معلوم اس حاشیہ کی کیا ضرورت تھی، اگر یہ استعمال صحیح ہے، تو اعتراض کا کیا حق ہے، اگر غلط ہے تو اسکی سند پیش کیجائے،

۴۔ اذا صنعت ملا یستحیا من مثلہ فاصنع ما شئت ص ۴۸ اس پر لکھا ہے کہ کذا وانظر کاش وہ یہ جملہ نہ لکھتے، حدیث شریف "اذا لم تستحی فاصنع ما شئت" کلام موجہ کہلاتا ہے اس کے ایک معنی وہ ہیں جو عوام جانتے ہیں، "جب تو بےحیا ہو جائے جو چاہے کر"

دوسرے معنی یہ ہیں "جب تو ایسا کام نہ کرے جس میں شرم و حیا کا موقع ہو تو پھر آزادی سے جو چاہے کر گزر" ہے "یہی معنی شارح نے اس جگہ بتائے ہیں، اس پر کذا وانظر لکھنا انتہا غفلت نہیں تو اور کیا ہے،

۵۔ص، ۹ پر تیالی الدُرّع جسے اصل میں صحیح طور پر ضبط کیا تھا "بضم فقتح" اسکی بابت خود شارح نے یہی صاف طور پر لکھا ہے جمع لیلۃ درعاء علی غیر قیاس" اس پر میمن صاحب فرماتے ہیں" یہاں اور پہلے بھی "درع" بضم دال و فتح را لکھا گیا ہے، اسکے کوئی معنی نہیں ہیں، حالانکہ تمام ائمہ لغت اسے اسی طرح روایت کرتے ہیں، اگر کسی لغال نے کوئی کتاب لغت لکھی ہو، اور اس میں انکار کیا ہو اس کا پتہ دیا جائے، اور بتایا جائے کہ وہ کون صاحب ہیں، اور انھوں نے کس اعتبار سے یہ لکھا ہے،

۶۔ص ۵۰ پر شارح نے لکھا ہے کہ "وسمّی ایضًا الجُلبَۃ وجمعُھا جُلَبٌ" یعنی عُوذہ (تعویذ) کے ہم معنی جُلبہ بھی ہے، میمن صاحب تحریر فرماتے ہیں "یہ کلام مضطرب ہے، شاید اصل یہ ہو کہ اس طرح جمع ہونے میں لفظ ہے، نہ معنی میں" میمن صاحب نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کیا انھوں نے لغت عرب کا احاطہ کیا ہے، یا ان کی مادری زبان ہے، جنکی مادری زبان ہو وہ بھی کسی طرح ایسا دعوی نہیں کر سکتا، انھیں کہاں سے اور کیونکر یہ حق پہنچتا ہے، کہ بڑے بڑے ائمہ لغت کی بات کو بلا تحقیق رد کر دیں، آپ کو خود اضطراب ہو گیا، اصل کتاب میں کوئی اضطراب نہیں، تمام کتب لغت میں جلبہ اس معنی میں موجود ہے،

یہ کہنا بھی فضول و بے معنی ہے، کہ "ابو علی کی جس طرح کی غلطیاں ہیں، خود البکری نے بھی ایسی غلطیاں کی ہیں" اس سے غلطی کا بار ہلکا نہیں ہوتا، غلطیاں ہر ایک سے ہوا کرتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، مگر ایک علماء فضلا کی غلطیاں ہیں، اور ایک عوام و نفضولین، اور عجزہ و غرباء کے اغلاط ہیں،

جس طرح کسی شہسوار کا گرنا اور کسی اناڑی کا دونوں ہرگز یکساں نہیں ہو سکتے،!

ومن ذا الذی ترضی سجایاہ کلھا   کفی المرء نبلا ان تعد معایبہ

میمن صاحب خواہ مخواہ القالی کے حمایتی اور البکری کے دشمن بن گئے، ورنہ ان کا قدیم دستور ہے کہ جب

کسی کے حالات لکھتے ہیں، یا اس کی کتاب طبع کراتے ہیں، تو اسکی حمایت میں کمی نہیں کرتے، اور جہاں تک بن پڑتا ہے معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دیکھئے "ابن رشیق" کے حالات میں جس کی بابت عجیب و غریب خبر سنی گئی ہے، یہ لکھا ہے، "ابن رشیق کی کل تین غلطیاں معلوم ہوئی ہیں" غالبًا یہ پرانے زمانے کی بات ہے جب بی اے کورس کے ترجمہ کے واسطے دو سو کتابیں چھانی گئی تھیں، پھر بھی کئی جگہ بیاض چھوڑ دی تھی،

"ابو العلاء و ما الیہ" کا کیا کہنا اسکے واسطے میمن صاحب پورے زور و شور سے اٹھے، اور خوب حمایت کی، کتاب کیا تھی، نری تقریظ و مدح، نہ ابو العلاء کی کوئی علمی غلطی ملی، نہ مذہبی و اعتقادی غلطی ثابت ہو سکی، نہ الحاد کے خیالات کا ثبوت "لزوم ما لا یلزم" وغیرہ سے مل سکا، اور نہ نثر و نظم میں کوئی غلطی اس غریب اعمی نے کی، جس کی وجہ سے بصیر اس پر اس قدر فریفتہ ہو گیا، کہ تین سو صفحات سے زیادہ کی تالیف میں اسکی کوئی غلطی نہ نکال سکا، نہ نثر پر اعتراض کیا نہ نظم پر،

کتاب کیا ہے اول سے آخر تک مبالغہ آمیز مدح و ستائش ہے، کتاب کے واسطے پورے نقد کی ضرورت، نہ یہ بات صحف میں نہیں ملتی، جسے نقل کر دیا جائے، اسکی نظم و نثر پر فن کی حیثیت سے صحیح گفتگو کیجاتی اس کے خیالات کی تمحیص کیجاتی، صرف ادھر ادھر سے نقل کر کے غلط سلط رد و قدح کرنا، اور احکام شرعیہ کے واسطے حیلے نکالنا کہ شرع نے سارق کی حد کے لئے کوئی نصاب مقرر نہیں کیا، مرد میدان کا کام نہیں، ہر بات کے اہل کے لئے چھوڑ دیجائے تو بہتر ہے،

گذشتہ سال جب اللآلی کا نسخہ طبع ہو کر آیا تو میں نے بھی اس کا مطالعہ کیا، سرسری نظر میں جو اغلاط معلوم ہوئے، حسب دستور حاشیہ پر لکھتا گیا، جب انھیں یکجا کرنے کی فکر ہوئی، تو وحشت و افسوس و تعجب کی حد نہ رہی، کہ یہ اغلاط کا ذخیرہ "اللآلی" کے قریب حجم میں پہونچتا ہے، خیال ہوا مصر میں شائع کرایا جائے، کبھی یہ خیال ہوا کہ الامالی پر ایک منقح و مہذب کتاب لکھی جائے، جس میں ذیلی طور پر "اللآلی" کا محاکمہ بھی حسب ضرورت ہو جائے، اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ چند احباب نے اصرار کیا کہ "مشتے نمونہ از خروارے" ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو ممکن ہے

لوگ غلطی میں پھنس جائیں، اور حق و باطل میں تمیز اٹھ جائے، میمن صاحب اپنے کمال فن سے آیندہ تحریف و تصحیف کا میدان بخاری کی جگہ کہیں "قرآن" پر نہ قائم کر دیں، اور ان کے عجائب و غرائب سے لوگ مبہوت نہ ہو جائیں۔

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ ... فِي جَهَنَّمَ۔

اس تنقید میں اللآلی کے ۵۰ صفحات تک تفصیلی نظر کی ہے، باقی سرسری طور پر ادھر ادھر سے کچھ لے لیا ہے، اس تحریر کی دو اہم غایتیں اور مصلحتیں ہیں،

۱۔ صحیح اور اعلیٰ علم کی خدمت،

۲۔ میمن صاحب اور ان کے مقلدین کے واسطے تنبیہ اور موعظہ و عبرت، کہ آیندہ اپنی تحریر میں احتیاط سے کام لیں، اور بلا تحقیق اپنے خیال کی بنا پر کسی چیز کی تغلیط یا تصحیح نہ کریں، نیز ان لوگوں کو نصیحت و تنبیہ جو بڑے فضلاء کی خام باتوں کو پختہ سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں، وہ احتیاط سے کام لیں اور بغیر تحقیق و تفتیش کسی بات کو قبول نہ کریں اگر موقع ملا تو اس مضمون کو عربی میں بھی شائع کرا دیا جائے گا،

السمط کی اجمالی غلطیاں اس جگہ پہلے ہم "السمط" کے اہم اغلاط بطور تلخیص پیش کر دیتے ہیں، آیندہ ہر ایک کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئیگی، اسے بغور ملاحظہ فرمائیں،

۱۔ بے معنی غیر ضروری حوالوں سے حاشیہ کی تطویل،

۲۔ بلا تحقیق و نظر شارح کی تغلیط و تردید،

۳۔ اہل علم اور متقدمین کی طرف غلط نسبتیں، جو باتیں انھوں نے نہیں کہیں، ان کی طرف منسوب کرنا،

۴۔ زبردست علمی خیانت یعنی اصل نسخہ کی تحریف و تصحیف، چاہئے تھا کہ اصل نسخہ شائع کیا جاتا اور حاشیہ پر اپنی رائے پیش کیجاتی، متن کو محرف کر کے حاشیہ پر تنا زبردست خیانت ہی معمولی اغلاط نہیں بلکہ صحیح بخاری وغیرہ کے اغلاط بھی اپنی طرف سے گھڑ لئے گئے ہیں،

۵۔ اصل کتاب ابی علی قالی میں بہت سے اشکالات باقی ہیں، ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی، نیز بہت سے اغلاط باقی ہیں، جنکی اصلاح نہ کی،

۶۔ معمولی اور مشہور شعروں کے حوالہ میں خوب طول دیا ہے، اور ضرورت کے مقام پر سکوت کیا ہے حالانکہ نادر اور غیر معروف اشعار پر خاص توجہ مطلوب تھی،

۷۔ شارح کے سچے بیان کو خواہ مخواہ غلط بنانے کی فکر کی ہے، اور جہاں غلطی صاف صریح ہو اس سے چشم پوشی کی ہے،

۸۔ روایات یا اقوال کی تخریج میں یا غلطی کی ہے، یا غیر ضروری کی تخریج کی، اور ضروری کی طرف بالکل توجہ نہ کی،

۹۔ بہت سے الفاظ جن کا حل ہر جگہ مل سکتا ہے، استفہام کی علامت یا کذا لکھکر چھوڑ دئے حالانکہ آٹھ برس کی مہلت کافی تھی، نہیں تو مثل سابق "ابو عبد اللہ السورتی" سے دریافت کرتے، جیسا پیشاور سے دریافت کیا جاتا تھا،

۱۰۔ حوالہ میں جہاں معمولی کتابوں کی کثرت ہے، اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا حوالہ کم دیا گیا ہے، جمہرہ ابن درید میں بہت سے اشعار وغیرہ ہوں گے، ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، اسی طرح ائمہ فن مثلاً ابن السکیت وغیرہ کی کتابوں کا حوالہ ترک کر دیا گیا ہے، جو اصول فن ہیں، اتلاک عشرہ کاملہ۔

لطیفہ میمنی صاحب اپنے استقصاء اور وسعت نظر کے بہت ہی مداح ہیں، اور ایسا ہی ہوا کرتا ہے، قسطنطنیہ مصر وغیرہ کا حج و طواف کیا، وہاں کے کتب خانوں کی خوب سیر کی، خود علی گڈہ کے پروفیسر میس نے الواضح المبین حافظ مغلطائی کی شائع کی، تعجب ہے کہ وہ ان کے نظر سے غائب رہی، اسکے ص ۲۹ پر مغلطائی لکھتے ہیں:۔

"میں نے اللآلی پر ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام القدح العالی فی الکلام علی اللآلی ہے"۔

کاش میمن صاحب اپنے وسیع سفر میں یہ حاشیہ بھی حاصل کر لیتے، تو ان کی بہت سی محنت ...
جاتی، اور ہمیں بھی بحث کے واسطے نیا سامان مل جاتا،

تفصیلی غلطیاں، ہر چند مقدمہ پر بحث کی زیادہ ضرورت نہیں، مگر میمن صاحب کی صناعت ادبیہ پر ایک ...
ذاتی ضرور مفید ہوگی، اور اس طرح صحیح علمی خدمت انجام پانے کی قوی امید ہے، کیونکہ فاضل راجکوٹی
عربی زبان کو بہت مکدر کرچکے اور کرتے جاتے ہیں، تکدر سے بچانا ہر ایک مومن مخلص، اور ہر ایک ذی ...
عقل کا اہم ترین فرض ہے،

باقی

دار المصنفین کی نئی تالیف

تابعینؓ

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین ان کے تربیت یافتہ تابعین
کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ
کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت
عمر بن عبد العزیزؓ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویسؓ قرنی، حضرت امام زین العابدینؓ، حضرت امام باقرؓ،
حضرت امام جعفر صادقؓ، حضرت محمد بن حنفیہؓ، حضرت سعید بن مسیبؓ، حضرت سعید بن جبیرؓ، حضرت محمد بن
سیرینؒ، امام ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر
تابعین کے سوانح، ان کے علمی مذہبی، اور اخلاقی و عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت:۔ چار روپیہ

"منیجر"

شبلی کا نظریۂ تاریخ

از

جناب سید محمد عبد اللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۲)

مغربی مآخذ — اس خالص اسلامی عنصر کے علاوہ ہمیں اب اس دوسرے پہلو کا سراغ لگانا ہے، جو شبلی کے تصور
تاریخ کا ایک بنیادی حصہ ہے، گذشتہ اوراق میں اس حقیقت کا کئی بار اعادہ ہو چکا ہے، کہ مشرق اپنے نئے تصورات کیلئے
بہت حد تک یورپ کا ممنون ہے، اور کسی شعبۂ زندگی میں ہم اس کے اثر اور احسان سے آزاد نہیں ہو سکتے یہاں تک
کہ ممالکِ مشرقی میں احیائے ملی کا پرجوش جذبہ بھی یورپ کی تحریکوں کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوا، اقبال اسی
حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

شبلی پر اس کا کہاں تک اثر ہوا؟ اس کا کچھ حال ہم شبلی پر اثرات کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، اور نہایت
وضاحت سے اس چیز کا اظہار کر چکے ہیں، کہ اسی مغربی تحریک نے حقیقت میں شبلی کو شبلی بنایا، اسی طوفان کے
تلاطم ہائے بے پناہ نے گوہر کو گوہر بنا کر چمکایا اور اسی سرچشمہ سے اس نگین علم کی آبیاری ہوئی،

یہ ایک ایسا واقعہ ہے، جس کا اعتراف خود شبلی نے متعدد مواقع پر اپنی تصانیف میں نہایت جرأت سے
کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں، "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھے ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی[1]

[1] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۶۶،

ہیں، اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئی تھیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا[51] شبلی اگرچہ رفتہ رفتہ ان غلط بیانیوں اور تعصب سے لبریز افترا پردازیوں کی وجہ سے جو یورپ کے مصنفین نے اسلام اور بانی اسلام صلعم کے متعلق روا رکھیں، یورپ سے بہت بیزار ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی بعض موقعوں پر اپنے جذبۂ تحسین کو چھپا نہ سکتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "یورپین مورخوں کی تصنیفات کشتِ زعفران نظر آتی ہیں"[52]۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ شبلی اس مغربی اثر کو قبول کرنے کے لئے کس قدر آمادہ تھے، اور انھوں نے کس طرح پہلے پہل اپنے آپ کو مغرب کے تخیل سے آشنا کیا، اور پھر ان کے غیر معتدل تصورات کی تردید کی، سب سے پہلے جن مغربی مصنفین کا اثر شبلی (اور دیگر اسلامی مورخین عہدِ حاضر) پر ہوا، وہ گبن، کارلائل، بکل اور ہیگل ہیں کہیں کہیں، رینکی، لیکی، بنتھم اور ہیوم کے فکر کی آمیزش بھی معلوم ہوتی ہے،

ان میں سے کارلایل اور گبن کا مطالعہ شبلی نے بامعانِ نظر اردو اور عربی ترجمہ کے صفحات میں کیا، کارلائل کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ کارلایل پڑھ رہا ہوں، اور وہ "میرے کام کی چیز ہے"، گبن کی کتاب "رومن امپائر" کا مطالعہ ۱۸۸۳ء میں ہی شبلی نے کر لیا تھا، جو سید صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھی، اور جس کا ترجمہ سید صاحب نے بصرف چھ "سو روپیہ کر دیا تھا"[53]۔

یہ ثابت کرنا کہ شبلی یورپ کے کسی خاص مفکر کے پیرو تھے، نہ صرف مشکل بلکہ غلط بھی ہوگا، شبلی درحقیقت ایک مسلم مورخ تھے، اسلامی تاریخ کی تائید و حمایت میں جو خیال انھیں پسند آتا تھا، اسکو حسب مطلب استعمال کرتے تھے، جہاں تک راقم کا خیال ہے، وہ کسی خاص مغربی نظریہ اور مسلک کے پابند نہ تھے،

| گبن کا وسیع نقطۂ نظر |

شبلی کے محبوب مفکرین میں جن کے مخصوص تصور تاریخی کے متعلق ایک آدھ جملہ بے جا نہ ہوگا، گبن سب سے زیادہ ممتاز ہے، اس نامور مورخ نے جس صدی میں اپنی شاندار تصنیف "رومن امپائر" مرتب کی، اس وقت یورپ میں "قومیت" اور "تنگ نظرانہ نسلی امتیاز" کا جذبہ بہت ترقی پر تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس عظیم المرتبت

۵۱ مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۲۲۲ ۵۲ جلد ۱ ص ۱۱ ۵۳ جلد ۱ ص ۲۰،

شخصیت کی کتاب اس محدود انخیال اثر سے بالکل پاک ہے[54] اس کتاب کا نقطۂ نظر وسیع ہے، اور اس نے اپنے دائرۂ عمل کو یورپ اور ایشیا تک پھیلا دیا ہے، اور اس نے بعض دوسرے مورخین کی طرح تنہا مغرب کی اقوام ہی کو شایستہ اعتنا نہیں خیال کیا، بلکہ مشرق کی اقوام پر بھی اس کی توجہ یکساں رہی ہے، ہیوم کا یہ خیال گبن کے طریق کار سے کتنا مختلف ہو کہ "صرف مہذب اقوام ہی ہمارے مطالعہ کے لائق ہیں" اور "دورِ بربریت" کے بیان کی تکلیف اٹھانا بے سود ہے، گبن نے جس بے تعصبی کے ساتھ اسلام، خلافتِ راشدہ اور اسلامی تہذیب کا ذکر کیا ہے، اس کے لئے اسلامی دنیا ہمیشہ خراجِ تشکر ادا کرتی رہے گی،

| کارلایل |

کارلائل کی کتاب "(Hero of Hero worship)" نے اسلامی دنیا کو بہت متاثر کیا، اس نے اس کتاب میں آنحضرت صلعم کا ذکر (Hero an Prophet) کے طور پر اس دلآویز انداز میں کیا ہے، کہ اس کا ہر ہر فقرہ وجد آور ہے، کارلائل کامل ایک صدی تک یورپ کے فکر اور تصور پر قابض رہا، اس کا سب سے بڑا خیال جو "تاریخ و تمدن" سے تعلق رکھتا ہے، غیر معمولی شخصیت کا نظریہ (Theory of great man) ہے، کارلایل کہتا ہے کہ تاریخ غیر معمولی شخصیتوں اور ناموروں کے غیر مختتم سلسلہ کا نام ہے، جو اپنے عمل اور حرکت سے تاریخ کو مرتب کرتے ہیں، اور ساری انسانی تہذیب اسی محور کے گرد گھومتی ہے، یہ ناموران عالی مقام "کتابِ فطرت کے الہام یافتہ ہوتے ہیں"، جو "وقتاً فوقتاً" دنیا میں نازل ہو کر تاریخ میں ایک ایک باب کا اضافہ کرتے رہتے ہیں[55]، کارلایل کی تحسین کا مستحق صرف وہی ہو سکتا ہے، جو "قوت" رکھتا ہو اور جس میں "ہیرو" کی خصوصیات پائی جاتی ہوں،

یہاں اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں، کہ کارلایل جرمنی سے بہت متاثر تھا، اور "مافوق الانسان" کا تصور جرمنی کے نزدیک ہمیشہ ایک پسندیدہ خیال رہا ہے،

۵۴ Walker, Outline of Victorian Literature P. 5.
۵۵ Encyclopaedia of Social Sciences, "History"
۵۶ Walker, Outline of Victorian Literature P. 5.

کارلائل کا یہ تصور اسلامی ذہنیت کے لئے بہت حد تک جاذب توجہ ہے، شبلی کا سلسلہ ہیروز آف اسلام گو اس نامور فلسفی کے ہیرو" سے مستعار نہیں، لیکن اس سے ملتا جلتا ضرور ہے، بیجا نہ ہو گا، اگر ہم اس سلسلے میں اپنے عہد کے فلسفی "اقبال" کے متعلق بھی یہ کہدیں کہ وہ بھی شبلی کی طرح کارلائل سے متاثر ہیں،

بکل، علامہ ابن خلدون نے جس فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی تھی، اس کے حدود یورپ میں جن لوگوں نے وسیع کئے، ان میں بکل کا نام سب سے ممتاز ہے، اسکی معرکۃ الآراء تصنیف "تاریخ تمدن انگلینڈ" (۱۸۵۷ء) نے طبعی حالات کا اثر معاشرت پر کے نظریہ کو نہایت مدلل طریقے سے پیش کیا، اور واقعات اور سیاسی حوادث کے اسباب تلاش کرنے کے خیال پر بہت زور دیا، کانٹ اور بکل اور ہیوم (Hume) نے اجتماعات انسانی کی نفسیات اور ان کے اجتماعی عمل اور رد عمل کے قواعد مرتب کئے، اور مورخین کو دعوت دی، کہ وہ صرف اشخاص و افراد ہی میں اپنی مساعی کو مرکوز نہ کر دیں بلکہ تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ کو اپنا اصلی نصب العین بنائیں، اس کے پیش نظر یہ بات صاف کہی جا سکتی ہے کہ ہمارا نامور مورخ بھی اس جماعت سے بہت متاثر ہوا،

ہیگل تعجب ہو کہ شبلی نے ہیگل کے اثر کا کہیں اعتراف نہیں کیا، حالانکہ ہیگل جس نے مذہب کو ترقی کی لازمی اور یقینی قرار دیا ہے[۵]، جس کے خیال میں مختلف مذاہب دنیا میں مختلف فرائض حسنہ کی انجام دہی کیلئے مبعوث ہوئے ہیں، (مثلاً اسلام عدل و انصاف کے لئے) اس قابل تھا، کہ اس "روحانی اساس تاریخ" کے نظریہ کی بدولت شبلی کے اعتراف کا مستحق ہوتا، پھر بھی یہ کہنا کچھ غلط نہ ہو گا، کہ اس کے خاموش اثرات شبلی کی تحریروں میں ملتے ہیں، گو اس روحانی خیال کو ایک مسلمان کو دوسرے سے لینے کی ضرورت نہ تھی، کہ یہ تو ایک مسلم کی خصوصیت اور اس کا خاص عقیدہ ہے،

اب اس کا یقین کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے، کہ شبلی جو یورپ کی کتابوں کو "کشت زعفران" کہکر پکارتے ہیں، یورپ کی فکر کو کہاں تک جذب کرنے کے لئے آمادہ تھے، ؟ اس لیے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ وہ انیسویں

۵ Encyclopaedia of Brillanica (14th ed) "History"

صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے "نظریہ ہائے تاریخ" سے بخوبی آشنا تھے، جو ان کے زمانے میں یورپ کے ورد زبان تھا،

ڈارون کا "ارتقاء" "انیسویں صدی" کے مخصوص خیالات میں دو باتیں ایسی ہیں، جو نہ صرف یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں بہت مقبول ہوئیں، ایک "وطنیت" اور "قومیت" کا عام احساس اور دوسرا نظریۂ ارتقاء" ہو، اس عہد کے مورخین میں یہ بات خاص طور پر پائی جاتی ہے، کہ وہ ہر بات میں قومی امتیازات سے متاثر ہوتے ہیں، اور ہر فعل ہر تحریک اور ہر انقلاب کی تاریخ اور ارتقاء پر بحث کرتے ہیں،

شبلی کی تصانیف میں "ارتقاء" کا نظریہ اکثر موقعوں پر زیر بحث آیا ہے، بلکہ جیسا کہ کسی دوسرے موقع پر بیان ہو چکا ہے، خود ڈارون کے "ارتقاء نوعی" کی تائید بھی ان کے مضامین میں ملتی ہے، رہا "قومیت" کا خیال تو اس کے لئے اس مغربی تحریک کے علاوہ بعض داخلی اسباب بھی تھے، جن کا اثر ہمارے مصنف پر ہوا،

سند اور حوالہ اس زمانے میں انگلستان کے مورخین کا ایک گروہ (Oxford group) کے نام سے مشہور ہوا، اس جماعت کی خصوصیت یہ ہے، کہ اس کے بعض ممتاز افراد نے تاریخی دیانت کو مورخ کا ایک ضروری فرض قرار دیتے ہوئے مآخذ کا صحیح حوالہ اور اقتباس اپنے لئے لازم قرار دیا، چنانچہ آج کل انہی کے تتبع میں اس اخلاقی فرض پر بہت زور دیا جاتا ہے، شبلی نے بھی اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی،

معاون تاریخ، اس دور میں سائنس کے عام رواج نے مورخین کو اس نکتہ سے آگاہ کیا، ہو کہ تاریخ تو اپنی تکمیل کے لئے سائنس کے مختلف شعبوں سے کام لینا چاہیئے، چنانچہ آثار قدیمہ، پرانے کتبوں، قدیم سکوں اور فرمانوں سے تاریخ کی تصحیح و ترتیب ہونے لگی، پرانی کتابوں کی تلاش اور نئے ذخیرۂ معلومات کی تحقیق ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا، اور محققین اسی شوق و جستجو میں گوشے گوشے اور کونے کونے میں کتاب کے کیڑے بن کر اور تخیل مواد ڈھونڈنے لگے، اس کا اثر ہندوستان میں بھی ہوا، اب تک بعض لوگ اسی کو سب سے ضروری کام سمجھتے ہیں، شبلی نے بھی عموماً اپنی کل تصانیف اور خاص طور سے سیرۃ النبی میں ان نے تحقیقی طریقوں سے کام لینے کی کوشش کی اگرچہ

انھوں نے اس طریقہ میں خود کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ سب یورپ کی کتابوں سے ماخوذ ہے، لیکن انھوں نے یورپ کی ان جانفشانیوں سے پورا فائدہ اٹھایا،

سائنس یا آرٹ؟ آج کل یہ سوال معرکہ آرا بن گیا ہے، کہ "تاریخ سائنس ہے، یا آرٹ"؟ شبلی کے دور میں اس کی نوعیت اس سے مختلف تھی، اس وقت مورخین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ تاریخ لٹریچر کی شاخ ہے، اور دوسرے کا خیال تھا کہ سائنس ہے"

شبلی کہتے ہیں کہ مورخ کا فرض یہ ہے، کہ وہ سادہ واقعہ نگاری سے تجاوز نہ کرے، چنانچہ رومی کے متعلق ان کا بیان ہے کہ "اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا"[1] شبلی کے نزدیک فلسفہ، انشا پردازی اور تاریخ کی سرحدیں جدا ہیں، ان میں وہی فرق ہے جو ایک خاکہ، نقشہ اور تصویر میں ہوتا ہے[2] اگرچہ فلسفہ آمیز انشا پردازانہ تاریخ بہت مقبول ہوتی ہے، لیکن شبلی واقعات کو اصلی سادہ رنگ میں تحریر کرنے کو مذکورہ بالا طریقہ تحریر پر ترجیح دیتے ہیں،

مغربی نظریہ کی تنقید: شبلی یورپ کی بعض خوبیوں کے معترف اور مداح تھے، اس کا ثبوت اس سے پہلے دیا جا چکا ہے، اس مقام پر یورپ کی تاریخ دانی کے متعلق ان کی مجموعی رائے کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے، شاید شبلی سے زیادہ کسی نے یورپ کی ان علمی فیاضیوں کا ذکر نہ کیا ہوگا، جو یورپ کے علماء کی ایک خاص صفت بن چکی ہے، مقالات میں لکھتے ہیں "یورپ کی علمی فیاضیوں سے مردہ علوم و فنون زندہ ہو رہے ہیں"[3] جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، شبلی مورخین مغرب کے طریق کار (Method) کو بہت پسند کرتے تھے، اور وہاں کے فلسفیانہ استنتاج کے بے حد قائل تھے، اسی لئے ان کی تصنیفات کو "کشت زعفران" کے نام سے تعبیر کرتے تھے،

وہ سب سے زیادہ یورپ کی جس چیز کے قائل تھے، وہ فلسفۂ تاریخ ہے، المامون میں لکھتے ہیں "میں علانیہ

۱ الفاروق جلد ۱ ص ۲۱ ۲ ایضاً ۳ مقالات ص ۱۲۳،

اعتراف کرتا ہوں، کہ موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہونچ گیا ہے، اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافے کئے ہیں، اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصانیف ہمارے مقصد کے لئے بالکل کافی نہیں"[1]

اہل یورپ نے "واقعات کے اسباب" پر بحث کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اور اس سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ جو جو تاریخی نتائج نکالے جاتے ہیں، وہ شبلی کے نزدیک علم تاریخ کی جان ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع و ایجاد پر زیادہ تر ناز ہے، وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے"[2] مجموعی طور پر یورپ نے تاریخ و تذکرہ کے باب میں جو ترقیاں کی ہیں، شبلی کو ان کو پورا اعتراف ہے، اس خاص خصوصیت میں انھیں اپنی قدیم کتابیں بھی بعض اوقات ناکافی معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ ایک موقع پر وہ صاف صاف کہتے ہیں، کہ "تاریخ و تذکرہ کے فن میں آج جو ترقی ہو رہی ہے، اس کے لحاظ سے یہ بے بہا خزانے بھی چنداں کار آمد نہیں"[3]

لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہی شبلی یورپ کی مورخانہ بے اعتدالیوں پر دانشگاف بحث کرتے ہیں، اور اس سارے نظام کی جس کا ظاہر تو بے شک خوشنما اور دلآویز ہے، لیکن باطن نہایت بدنما ہے، پوری طرح پردہ دری کرتے ہیں، ملک کے نوجوانوں میں جو یورپ کی "ہر ادا پر جان دیتے ہیں" اور جن کے نزدیک "ہرچہ آید در نظر غیر تو نیست" پر عمل کرنا ضروری ہے، یورپ کی مقلدانہ مداحی کا جذبہ شبلی کے نزدیک بے حمیتی سے کم نہیں، چنانچہ وہ قدم قدم پر ملک کو اس اندھی بہری تقلید سے روکتے ہیں، وہ اپنی روایات کا ہر موقع پر یورپ کی روش سے مقابلہ و موازنہ کر کے یہ ثابت کرتے ہیں، کہ گو آج ہم کچھ نہیں، لیکن ہمارے اسلاف بہت کچھ تھے، ہماری علمی ترقیوں نے کسی زمانہ میں یورپ سے بزور اعتراف کا خراج وصول کیا تھا، نیز یورپ کی جدید تہذیب نے ہماری ہی شائستہ اور علم پرور گود میں پرورش پائی

۱ المامون جلد ۱ ص ۵ ۲ ایضاً، جلد ۱ ص ۶-۷، ۳ الفاروق جلد ۱ ص ۱۰،

وہ اس استادی کے "جس کا مردہ فخر آج بھی مسلمانوں کے دماغ کو مختل کر رہا ہے" قائل ہیں، لیکن اس بارے میں ان کا لہجہ کچھ حزم و احتیاط کا پہلو لئے ہوئے ہے، غالباً ہمارا مورخ ان علمی عرق ریزیوں کے تسلیم و اعتراف کے ساتھ ساتھ یورپ کے اس تعصب کو نہیں فراموش کر سکتا، جو صدیوں تک یورپ نے اسلام اور بانیٔ اسلام کے ساتھ روا رکھا، اور یہ ظاہر ہے کہ تعصب اور مورخانہ غیر جانبداری میں اتنا ہی بعد ہے، جتنا مشرق اور مغرب میں اور وہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"۔

یورپ کی بے اعتدالی

فن تاریخ میں "روایت و درایت کے اصول" اور قوانین کی ایجاد کا فخر تو خیر مسلمانوں کو حاصل ہی ہے، اور یہ وہ میدان ہے، جس سے یورپ آشنا ہی نہیں[1]، لیکن خود "علت و معلول" کے اصول کے متعلق یورپ نے بعض ایسی بے اعتدالیاں کی ہیں، جن کی طرف شبلی نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے، اس سلسلے میں مورخین یورپ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے، کہ وہ واقعات کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لئے اسکو ایسی ترتیب دیتے ہیں، کہ واقعہ ان کے اجتہاد کے بالکل مطابق ہو جاتا ہے، اس کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ اور اس میں مورخ کا اجتہاد کہاں تک ہے؟[2]

شبلی اس طریق کار کو یورپ کے استدلال کی "ملمع سازی" کا نام دیتے ہیں[3]،

شبلی کو یورپ کی تاریخ میں ایک بہت بڑا نقص یہ نظر آتا ہے، کہ اس میں راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ اگر ایسا کوئی موقع پیش آجاتا ہے، تو ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات الگ کر لئے جاتے ہیں، جو عقل کے معیار پر پورے اترتے ہیں، پھر اس سے ایک کتاب یا تاریخ بنا لی جاتی ہے، اور یہی اصول تصنیف ہے، جو یورپ کی تصانیف کی بنیاد ہے[4]؛

شبلی کہتے ہیں کہ یہ تو درست ہے، کہ مغربی مصنف سلسلۂ اسباب کی تلاش میں بہت محنت سے کام

[1] الفاروق جلد ۱ ص ۱۴، [2] ایضاً جلد ۱ ص ۲۲، [3] ایضاً جلد ۲ ص ۶۷ [4] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۳۵،

لیتے ہیں، لیکن اس میں بہت کچھ ان کی "خود غرضی" اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہاں کا مورخ اپنے مقصد کو محور بنا لیتا ہے، اور تمام واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں[5]۔

شبلی نے اس خاص معاملہ میں اسلامی مورخ اور مغربی مورخ کا موازنہ بھی کیا ہے، شبلی کے نزدیک اسلامی مورخ اس طرفداری سے الگ رہتا ہے، وہ واقعات کی غیر جانبدارانہ تلاش میں اس بات کی پروا نہیں کرتا، کہ اس کا اثر اس کے مذہب اور معتقدات اور تاریخ پر کیا پڑے گا، "اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، اور وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے[6]" لیکن اس بے لوث واقعیت کی تلاش میں حد سے زیادہ تفریط کا مرتکب ہو جاتا ہے یعنی "واقعات" اور "رائے" کو بالکل ملنے نہیں دیتا، جس سے اسکی تاریخ کے واقعات "خشک" اور "ادھورے" رہ جاتے ہیں،

ہم کو اس موقع پر شبلی کی عام رائے سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یورپین تاریخ پر شبلی کی تنقید کے ضمن میں اتنا ضرور کہیں گے، کہ نشأۃ جدیدہ کے یورپ کا سب سے بڑا فلسفی مورخ رینکے جس کی تعریف میں شبلی بھی رطب اللسان ہیں، تاریخ کے لئے اسی قسم کی غیر جانبداری کو ضروری قرار دیتا ہے یہاں تک کہ اسکی تاریخ سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا، کہ مورخ کس قوم مذہب اور فرقہ سے تعلق رکھتا ہے مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ علمی بے تعصبی کی ترقی کے باوجود یورپ کے مورخ اور علماء ایک عرصہ تک اس قدیم تعصب آموز ماحول کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے، اور عجب نہیں کہ اگر آج بھی کریدا جائے تو بعض خوشنما الفاظ کے اندر ہی تلخ معانی پنہاں نظر آئیں، تاہم یہ ایک حقیقت تھی، جس کا اظہار کر دیا گیا،

شبلی یورپ کی "مورخانہ" قابلیت اور بلندی کے ہمیشہ اسی طرح معترف رہے، جس طرح شروع شروع میں تھے، لیکن وہ جس قدر ان مورخوں کی اسلامی تاریخوں کو دیکھتے جاتے تھے، اسی قدر ان کی حیرت بڑھتی جاتی تھی، جو بعد میں پریشانی اور بالآخر غصہ اور احتجاج کی شکل میں تبدیل ہو گئی،

[5] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۵۳، [6] ایضاً

یورپ کا تعصب عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان محاربات صلیبی (Crusades) کے زمانے سے جو زبردست کشمکش چلی آتی تھی، اس کی بنیاد دراصل اس سے بھی قبل مسلمانوں کی فتح اندلس کے وقت پڑ چکی تھی، اور جس کی تکمیل ترکوں کی فتوحات کی شکل میں ہوئی، اس کے زیر اثر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یورپ کا تعصب ایک ایسا جذبہ تھا، جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث ہو کر ان کے بچے بچے کے دل میں پیدا ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کا تعلق خون، گوشت اور پوست اور نظام عصبی سے ہو چکا تھا،

جب یورپ کے مورخ نے اپنی پرانی حدود سے باہر جھانک کر دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تو اس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بھی کتابیں لکھیں، جن میں تعصبات اور غلط بیانیوں کا حصہ غالب تھا، یہ درست ہے کہ ان کے خیالات میں آہستہ آہستہ وسعت پیدا ہوتی گئی، اور صحیح غیر جانبدارانہ تحقیق کی طرف دل مائل ہوتے گئے، لیکن پرانی روش سے ہٹتے ہٹتے بھی ایک عرصہ درکار تھا، ابھی یہ پورا نہ ہوا تھا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں "مادیت" "ملک گیری" اور ملوکیت کی ایک زبردست لہر پیدا ہو گئی جس نے ایک طرف یورپ میں نسل (Race) اور "محدود قومیت" (Parochial nationalism) کے تخیل کو بیدار کر دیا، اور دوسری طرف اس جذبہ کے ماتحت ایشیا کی اسلامی سلطنتوں پر قبضہ کرنے کیلئے بانیٔ اسلام صلعم اور نئی پرانی اسلامی حکومتوں کے متعلق وسیع پیمانے پر غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں، اس ملوکیت کی تبلیغ نے مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں، "کبھی آزادی جمہور کا صور پھونکا گیا، کبھی شخصی آزادی اور مساوات و اخوت کے نغمے گائے گئے، اور کبھی بے تعصبی اور عام رواداری کے خطبے سنائے گئے، لیکن اسلام اور شاہان اسلام پر حملے ہر حالت میں جاری رہے،

شبلی کہتے ہیں اگر دنیا کی عجیب غریب غلط فہمیوں کی فہرست تیار کیجائے تو ان میں یورپ اور مورخین یورپ کی ان غلط بیانیوں کو سب سے اونچے درجے پر رکھنا پڑے گا،[۱] اگر کوئی شخص صرف ان غلط فہمیوں کو دور کرنا

[۱] رسائل کتب خانہ اسکندریہ،

اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لے، تو اس کے لئے ایک عمر کافی نہ ہوگی، بلکہ اس کام کی تکمیل کے لئے اسے خدا سے ایک اور عمر کی دعا کرنی پڑے گی، شبلی نے مقالات اور رسائل میں چند موٹی موٹی تاریخی افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے، لیکن یورپ نے شاہان اسلام کی جو تاریک تصویر کھینچی ہے، اس کو تاریکی سے چھڑانے کے لئے تنہا ان کی کوششیں کافی نہ تھیں، "کتب خانہ اسکندریہ" میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ دراصل اس کو عیسائیوں نے جلایا تھا، لیکن اس الزام کے مورد مسلمان بنائے گئے، ع

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

جزیہ کی رسم،[۱] "اورنگ زیب کے متعلق غلط فہمیاں"[۲] "ترکی حکومت کی بدانتظامیاں"[۳] یہ وہ موضوع ہیں جن پر مورخین یورپ نے بہت زور قلم صرف کیا ہے، اس کے جواب میں شبلی نے بھی مورخانہ قلم اٹھا کر غلط بیانیوں کی تردید کی ہے،

غلطی کی بنیاد شبلی کے نزدیک مغربی مصنفین کی ان غلط بیانیوں کی وجہ تعصب کے علاوہ یہ بھی تھی، کہ وہ پرانے زمانہ کا مقابلہ جدید دور سے کرتے ہیں، حالانکہ یہ ایک غلط اصول ہے، اور مورخانہ دیانت داری اور ہمدردی کا تقاضا ہے، کہ ہم ماضی کو صرف ماضی کے معیار سے دیکھیں اور موجودہ طرز سلطنت سے ایشیائی حکومتوں کو نہ ناپیں[۴]

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بعض بادشاہوں کے ذاتی افعال کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں،[۵] حالانکہ یہ انفرادی افعال ہیں، جو یورپ کے بادشاہوں سے بھی سرزد ہوتے رہے ہیں، ان کیلئے مذہب کو ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا،

ان معاملات کے متعلق جدید تحقیقاتوں نے بڑی حد تک وہی روش اختیار کی ہے جو شبلی نے کی تھی، چنانچہ مستشرقین کی جدید کتابیں ان غلط بیانیوں کے سلسلے میں شبلی کی ہم نوا ہیں،

[۱] الجزیہ، [۲] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، [۳] سفرنامۂ روم و شام، [۴] المامون جلد اول ص ۱۵۲، [۵] ر ص ۱۰۳

آنحضرت صلعم کے مغربی سوانح نگار

یوں تو اسلامی تاریخ کا کونسا شعبہ ہے، جس پر یورپ نے قلم نہیں اٹھایا، اور اس میں مسلمان بادشاہوں کی ذات، ان کی طرز سلطنت، اسلامی حکومت کی بدانتظامیوں اور ان کے تاریک پہلوؤں کو نمایاں نہیں کیا، لیکن خود بانئے اسلام صلعم کی ذات مبارک بھی ان حملوں سے نہیں بچی، آنحضرت صلعم کے متعلق تصانیف کا آغاز بلدی برٹ سے ہوتا ہے، جس نے ۱۲۳۹ء میں سب سے پہلے ایک کتاب لکھی، اس کے بعد اس موضوع سے اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی، کہ آنحضرت صلعم کے سوانح نگاروں کی صف میں جگہ پانا ایک مغتنم چیز سمجھی جانے لگی[1]،

شبلی نے جب سیرۃ النبی کے لئے یورپ کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا، تو انکو پڑھکر وہ روز بروز دل شکستہ ہوتے گئے، چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں، "یورپین مورخوں پر روز بروز حیرت بڑھتی جاتی ہے[2]" وليهازن نولڈکی، مارگولس، فان کریمر، اور دوسرے مورخین کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا، کہ کوئی یورپین مورخ سیرت پر کتاب لکھ ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس باب میں جس غیر جانبداری احتیاط، اصول حدیث سے واقفیت اور ہمدردی کی ضرورت ہے، وہ کسی غیر مسلم کو میسر ہی نہیں آسکتی[3]"

سوانح نگاروں کی تین قسمیں

شبلی آنحضرت صلعم کے سوانح نگاروں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک وہ جو عربی زبان اور اصل کتابوں سے واقف نہیں، اور انھوں نے ترجموں اور دوسروں کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے، اس جماعت کی تاریخوں کی صحت اور معتبر ہونے کے متعلق کون اچھی رائے قائم کر سکتا ہے، اگرچہ ان ہی میں گبن جیسے صائب الرائے اور انصاف پرست بھی ہیں جو "راکھ کے ڈھیر میں سے سونے کے ذرّے نکال لیتے ہیں[4]" لیکن ایسے بہت کم ہیں، دوسرے وہ ہیں، جو عربی زبان کے اور فلسفہ و ادب کے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر سے آشنا نہیں، ظاہر ہے کہ مذہبی اصول سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اس گروہ کی نامذہبی طرز کی تالیف کردہ کتابیں، چنداں قابل اعتنا نہیں ہو سکتیں، مثلاً سخاؤ (Sachau) اس کا مضمون قرآن کتنا زہر سے بھرا ہوا ہے، تیسرے وہ ہیں جو

دیکھتے سب کچھ ہیں، لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں،

[1] تفصیل کیلئے دیکھو دیباچہ سیرۃ النبی جلد ا ص ۸۲ [2] یہ قول مارگولیتھ کا ہے [3] مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۲۵ [4] جلد ا ص ۲۱۲ [5] سیرۃ النبی جلد ا ص ۶۷

یہ لوگ عربی زبان اور اسلامی لٹریچر کے بہت بڑے ماہر ہیں، مثلاً پامر، مارگولیس وغیرہ، لیکن انکے ترکش میں وہی تیر کل رہے ہیں، جو عام پادریوں کے پاس ہوتے ہیں، مارگولیس کے متعلق شبلی کا خیال ہے کہ "وہ دانستہ سادہ اور معمولی سی معمولی واقعات کو اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے" شبلی سب سے زیادہ اسی مصنف کے شکوہ سنج ہیں جس کا علم بھی اسے تعصب اور جنبہ داری کے مرض سے شفا نہ دے سکا، چنانچہ ایک خط میں جھنجھلا کر انکی لائف آف محمدؐ کے متعلق لکھتے ہیں، "ایک حرف بھی ساری کتاب میں صحیح نہیں[1]"،

اصولی غلطی

جہاں تک اصول کا تعلق ہے، یورپ کے سیرت نگاروں کی اس غلطی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کے بجائے مغازی اور سیرت کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے، جن کا درجہ حدیث سے کم ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ سرے سے روایت کے اصول اور اسکی اہمیت ہی سے باخبر نہیں، یورپ میں اگر ایک بازاری آدمی ایک جھوٹی بات کو معقول پیرایہ میں بیان کر دیگا، تو وہاں کا مورخ اسکو قبول کر لے گا، لیکن مسلمان مورخ کے نزدیک راوی کے سچا یا جھوٹا ہونے کا پہلے پتہ چلایا جائے گا،

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک بار پھر اس حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں، کہ شبلی یورپ کے مقلد تھے نہ عقیدتمند لیکن ان لوگوں کی علمی سرگرمیوں کو دل وجان سے پسند کرتے تھے وہ عام طور پر یورپ ہی کی مثال پیش کر کے اپنے علماء و فضلا کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا کرتے تھے، ذیل کا ایک اقتباس ثبوت کے لئے کافی ہے[2]،

"ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کے کافر بنانے میں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں، جو صحابہ کافروں کو مسلمان بنانے میں کرتے تھے، دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آبِ حیات برسا رہا ہے، دنیا کے تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں، اور دنیا کی نمائش گاہ ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجا دی گئی ہے، کہ گویا پچھلا زمانہ اس سروسامان سے دوبارہ سامنے آگیا ہے"

[1] مکاتیب، جلد ا ص ۲۱۳، [2] مقالات ص ۱۲۲،

عہدِ وسطیٰ کی تاریخ مصر پر ایک نظر

از

جناب محمد جمیل الرحمن صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(۲)

عہدِ فاطمین کا خاتمہ درحقیقت مصر کی خالص قومی حکومت کا خاتمہ تھا، یہ خلفا گو بیرونی سیاسیات میں اکثر پھنس جاتے تھے، مگر ان کا اصلی وطن مصر ہی قرار پایا تھا، کہ وہ وہین کی فلاح و بہبود کے ہو رہے تھے، اس لئے ان کے زمانہ میں ملک امن و امان کی برکتون سے مالامال ہو رہا تھا، فاطمین کے جانشین سلطان صلاح الدین کی حالت اس سے جداگانہ تھی، سیاسی لحاظ سے ایوبی درحقیقت سلاجقہ کے سچے جانشین تھے، سلاجقہ نے اول تو اسلامی ایشیا کو مدتوں کے بعد ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا تھا، اور دوسرے غیر مسلموں سے مقابلہ کرکے مسلمانوں کی حفاظت کی تھی، یہی فرض ایوبیوں کو بھی انجام دینا تھا، چنانچہ اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑنے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ خاندان یقیناً شہید کہلانے کا مستحق ہے، کیونکہ ایوبیوں نے اپنی زندگی کا واحد مقصد ہی یہ قرار دے لیا تھا، لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے مصر ایوبی قبضہ کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر سیاسیاتِ عالم کے چکروں میں پھنس گیا، صلاح الدین کے زمانہ میں صلیبی جنگیں اپنے پورے شباب پر تھیں، اور ایوبیوں کو سلاجقہ کے جانشین اور فاطمین کے بعد مصر کے حاکم ہونے کی حیثیت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا، اس طرح مصر مشرق و مغرب کے درمیان میدانِ جنگ بنا اور شام کی قسمت بھی اس کے ساتھ وابستہ رہی،

لیکن افسوس ہے کہ صلاح الدین نے جو زبردست سلطنت قائم کی تھی، اس کے جانشین اُس کو سنبھال نہ سکے، خاندانی اتحاد کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا، سلطنت چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گئی، اور ہر حکمراں اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگا، واقعات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان مختلف خاندانوں کا واحد مقصد ہی یہ ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پارہ پارہ کر دیں، صلاح الدین، ملک العادل اور ملک الکامل ایوبیین کے ابتدائی اور نہایت کامراں بادشاہ تھے، ان کی قوت کا انحصار قبیلہ عزیز پر تھا، اور یہ ممکن تھا کہ جس طرح فاطمین نے مذہب کی بنیادوں پر حکومت کی بنیاد قائم کی تھی، ایوبی نسلی اساس سے کام لیں، لیکن یہ امیدین خاندان کی باہمی جنگوں سے خاک میں مل گئیں، آخر کار حکمراں خاندان کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا، ان سلاطین نے پھر وہی غلطی کی جو مسلمان اس سے قبل اکثر کر چکے تھے، انھوں نے مملوکوں کو فوجوں میں بھرتی کرنا شروع کر دیا، ان نئے سپہ سالاروں نے آپس میں رشتہ داریاں قائم کیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ یہ لوگ بجائے حکومت کی مستقل فوج بننے کے اسکے مدِ مقابل بن گئے، ان مملوکوں میں بھی مختلف عناصر شامل تھے، گو ترکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن مغالبہ اور یونانی بھی ان میں مفقود نہیں تھے، ہر طبقہ اپنے اپنے جھنڈے کے نیچے لڑنے کا عادی تھا، اس سے ان کے فساد میں اور اضافہ ہوا، مختصر یہ ہے کہ اس مسلسل خانہ جنگی کے فرو کرنے کی غرض سے حکمرانوں کو روز بروز اپنے افسرانِ فوج پر زیادہ بھروسا کرنا پڑا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ مختلف بلند حوصلہ سپہ سالاروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے، اس کے بعد تاریخ نے ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرایا، بادشاہ پہلے ہی صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے، اب وہ بالکل بے دست و پا ہو گئے، اور وہ لوگ جو انھیں بے دست و پا کرنے کے باعث ہوئے تھے، انھوں نے حکومت کی تمام ذمہ داریاں اپنے اوپر لیں،

اب مملوک مصر کے حکمراں بنے، انھوں نے رفتہ رفتہ خاندانی حکومت کا خیال بالکل ترک کر دیا، پیروی ہے کہ ایوبیوں کا نظم و نسق مکمل طور پر قائم اور جاری رہا، بحری مملوک قلاؤن کے زمانے میں یہ بھی ممکن ہوا کہ ایک قسم کی خاندانی حکومت قائم کی جائے، لیکن مملوکوں کی حکومت نہ صرف اصولاً فوجی جماعت کی حکومت تھی بلکہ عملاً بھی ایسی ہی تھی چنانچہ انھوں نے ایک فوجی جاگیری نظام قائم کیا، اور اس کی بنیاد مکمل فوجی نظام پر رکھی،

جس سے مصر جاگیری مملکت بن گیا، لیکن فرق یہ تھا کہ ان جاگیروں کی بنیاد زمین کی ملکیت پر نہ تھی، بلکہ زمین کے لگان پر تھی، اسکی تفصیل یہ ہے کہ فوجی نقطۂ نظر سے کاشتکاروں پر نگرانی رکھنا محض بے کار اور یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ جاگیردار اس کام میں اپنا وقت ضائع کریں، چنانچہ ان زرخرید غلاموں کو جو اب تک زمینیں کاشت کرتے تھے، اس شرط کیساتھ آزاد کر دیا گیا، کہ وہ بدستور سابق جاگیرداروں کو لگان ادا کرتے رہیں یہ فوجی امرا حقیقت میں مصر کی آبادی کا اعلیٰ طبقہ شمار ہوتے تھے، وہ اپنی معاشی اور معاشرتی برتری کو بعض اوقات نہایت بری طرح استعمال کرتے تھے، لیکن باوجود اس انتظام کے مملوک برابر آپس میں لڑتے رہتے تھے، وہ نہ ملک پر حکومت کرتے، اور نہ زمین سے کوئی تعلق رکھتے تھے، نسلی طور پر وہ مصر کیلئے اجنبی تھے، اور خالص مصریوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بھی بہت کم تھی، لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ صدیوں تک اپنی حیثیت سنبھالے رہے، اور مصر ان کے زیر نگیں رہا، یہ محض اتفاقی امر نہیں تھا، بلکہ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے، کہ ملک پر ان کی گرفت کس قدر زبردست تھی، اور ان کا نظم و نسق کتنا باقاعدہ تھا، کہ ان خرابیوں کے باوجود اہل مصر ان سے آزاد نہ ہو سکے، خصوصًا ان کا مالی نظام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا،

لیکن ناانصافی ہو گی اگر ہم مملوکوں کی خرابیاں بیان کرنیکے ساتھ انکی ان خدمات کو بھول جائیں جو انھوں نے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تمام دنیا کے لئے انجام دیں، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مملوک ہی تھے جنھوں نے تاتاریوں کے مقابلے میں سد سکندری کا کام کیا، اور مصر کو اس سیلاب سے بچا لیا، ورنہ اس کا وہی حشر ہوتا، جو اس سے قبل عراق اور ایران کا ہو چکا تھا، یہ کوئی بخت و اتفاق نہ تھا، کہ عین جالوت کی جنگ میں سلطان بیبرس نے تاتاریوں کو شکست دی تھی، کیونکہ بیبرس کے بعد قلاؤن اور اس کے جانشینوں نے بھی ایل خانیوں کے مقابلہ میں اسی طرح سد سکندری کا کام کیا تھا، اور تاتاریوں کو مصر سے ناکام و نامراد واپس جانا پڑتا تھا، وادی نیل کو ان کا شکرگذار ہونا چاہئے، کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ تمام اسلامی ممالک تاتاری سیلاب سے ایسے برباد ہوئے کہ ان کی تہذیب کے صرف کھنڈر باقی رہ گئے، اور بس مصر کی تمدنی ترقی کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہنے کے قابل بنایا، اس کے علاوہ وہ مملوک ہی تھے جنھوں نے صلیبی جنگوں کو ختم کیا، اور صلیبی مجاہدوں کو ایسی شکست دی، کہ وہ صدیوں تک ایشیا کا رخ نہ کر سکے، تاتاریوں سے مصر کو محفوظ رکھنے کے مقابلہ میں ان کا یہ کارنامہ بہت معمولی معلوم ہوتا ہے، مگر ایشیا کے لئے اسکی سیاسی اہمیت بالکل ظاہر ہے، ان کا تیسرا کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں، یہ کارنامہ فتح نوبیہ ہے، اس کی اہمیت فتح سوڈان سے کچھ کم نہیں، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مملوکوں کے پورے دور میں ہر طرف زبردست کامیابیوں کا ایک سلسلہ جاری ہے، اور شاید ہی کہیں ان سلاطین کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو،

ان ہی کارناموں کی بدولت سلاطین مملوک نے سلطنت مصر کو نہایت ہی طاقت ور اور منتظم حکومت بنا دیا، اور اسکو بین الاقوامی سیاسیات میں وہ درجہ دیدیا، جو درحقیقت اب تک کبھی مصر کو حاصل نہ ہوا تھا، تاتاریوں کے ایک حصہ سے تعلقات بڑھا کر انھوں نے ایل خانیوں کے مقابلے میں توازن قوت قائم کیا، اور بازنطینی اور اکثر دوسرے یورپی دول ہمیشہ ان عظیم الشان سلاطین کی دوستی کی خواہاں رہے، اسی زمانے میں جب کہ مملوکوں کے آپس میں مسلسل جنگیں جاری رہتی تھیں، اور خود قاہرہ کے گلی کوچے جنگ و جدل کے مرکز بنے ہوئے تھے، اس شہر میں ایک عالیشان عمارت کے بعد دوسری سربفلک عمارت بنتی چلی جاتی تھی، چنانچہ قاہرہ کی وہ عمارتیں جن کی وجہ سے اس شہر کو چار چاند لگ گئے ہیں، اور جنھیں دیکھنے کیلئے دنیا کھنچی چلی آتی ہے، وہ تقریبًا سب کی سب مملوکوں کے عہد کی ہیں،

یہاں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جنگی مہموں، فتوحات، اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے اتنی بڑی رقمیں کہاں سے آتی تھیں؟ اور وہ فوجیں کیسے جمع ہوتی تھیں، جن سے یہ عظیم الشان فتوحات مکمل ہوتی تھیں،؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مصر کی خوش قسمتی سے مملوک سلاطین میں ایک سلسلہ ایسے عظیم الشان حکمرانوں کا گذرا، جنھوں نے ملک کو مالا مال کر دیا، اس سلسلہ میں بیبرس، قلاؤن، ناصر، برقوق اور قایتبے شامل ہیں، مملوکوں کی سلطنت میں جہاں ہر فرد بشر خواہ وہ کتنا ہی ذلیل کیوں

نہ ہو، اپنے آپ کو ہر وقت دعویدار سلطنت سمجھتا تھا، صرف ایسے ہی لوگوں کو عروج حاصل ہوسکتا تھا جو غیر معمولی قابلیت رکھتے ہوں، فریق بندی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا، لیکن اس کے ساتھ ان میں ایسی عصبیت بھی تھی کہ خطرے کے موقع پر تمام اختلافات بالائے طاق رکھ کر سب مملوک بلا کسی تفریق کے یک جان ہوکر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے، اس کے علاوہ مملوکوں میں زیادہ تعداد ترکوں اور چراکسہ کی تھی جنھیں خاص طور پر بردہ فروشی کے بازاروں میں منتخب کیا جاتا تھا، یہ تو ہیں قدرتی طور پر جنگ جو واقع ہوئی ہیں، پھر ان غلاموں کو مختلف امراء کے تحت بہترین فوجی ترتیب دیجاتی تھی، سلطان بیبرس نے ایک اور بڑا سیاسی کام یہ انجام دیا تھا کہ اس سے قبل خلافت عباسیہ برباد ہوچکی تھی، اور اس خاندان کے افراد بے خانماں ہوکر تباہ حال و آوارہ پھر رہے تھے، بیبرس اسی خاندان کے ایک فرد کو تلاش کرکے قاہرہ لایا، اور وہاں اپنے زیر سیادت اسے تخت و تاج دونوں سے آراستہ کردیا، ظاہر ہے کہ یہ کام محض برائے نام تھا، لیکن اس زمانہ کی اسلامی دنیا پر اس کا جو اثر پڑا، اس کا اندازہ آج کل ہم نہیں لگا سکتے، اس واقعہ سے وہ لوگ بھی جو اب تک مملوکوں سے الگ رہے تھے، ان کے ہمدرد بن گئے، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا، کہ ان نام نہاد عباسی خلفاء کے تحت مملوکوں کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہوگئی، اس کے علاوہ مملوکوں کی حکومت عام طور پر سخت گیر واقع نہیں ہوئی تھی، وہ زراعت کی ترقی اور وسعت میں کوشاں رہتے تھے، آب پاشی کے لئے نہریں کھدواتے تھے، اور اسی قسم کی دوسری تدبیروں سے کاشتکاروں کی حالت کو درست کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کاشتکاروں میں ایک عنصر عرب بدوؤں کا بھی تھا، اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ طاقتور ہوتا جارہا تھا، بدو اپنی بے چین طبیعت سے مجبور تھے، اور اکثر فساد کا باعث بن جاتے تھے، ان فسادوں کو روکنے اور فرو کرنے میں مملوک سخت تدابیر اختیار کرتے تھے، مگر یہ فساد ایسے نہیں ہوتے تھے، کہ ان کی وجہ سے زراعت رک جائے، یا اسے نقصان پہنچے، بلکہ ان میں برابر ترقی ہوتی رہتی تھی، مملوکوں کی مالیات کی بنیاد محصول اراضی پر تھی، ان کے زمانے میں تہذیب و تمدن کے جو بڑے بڑے کام انجام پائے، ان سب کا انحصار اسی پر تھا، حکومت کی آمدنی کا

ایک اور بڑا ذریعہ ہندوستانی تجارت ہے، مصر قدیم زمانے سے لے کر اب تک یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارتی منڈی بنا رہا ہے، ہندوستانی تجارت کا تمام مال اسی سے ہوکر گذرتا تھا، ۱۴۹۲ء کے بعد جب یہ خصوصیت مملوکوں کے ہاتھ سے نکل گئی تو ان کا عروج اور ان کی حکومت بھی ختم ہوگئی، اب پرتگیزوں نے بحر ہند اور بحیرۂ احمر میں اپنے قدم جمائے، اور ہندی تجارت کا رخ راس امید کی طرف پھیر دیا، یہ واقعہ حقیقت میں نہ صرف مصر بلکہ تمام اسلامی دنیا کے لئے پیغام موت تھا، ایک طرف تو مصر کی بربادی کا یہ سامان ہورہا تھا، دوسری طرف عثمانیوں کی ترقیاں جاری تھیں، انھوں نے وادی نیل پر قبضہ کرلیا، اب یہ ملک سلطنت قسطنطنیہ کا محض ایک صوبہ بن گیا، اور اسکی ذاتی شان و شوکت بالکل رخصت ہوگئی، معاشی نقطۂ نظر سے مصر مشرقی بحیرۂ روم کی تجارت کا مرکز تھا، مگر اب دنیا کی تجارت کا رُخ بدل گیا، اور پھر امریکہ کی دریافت سے دنیا کی تہذیب کا مرکز بھی کہیں کا کہیں جا پڑا، لہذا قدرۃً مصر پر ادبار کی گھٹائیں چھاگئیں،

(۸)

آغاز ربیع الثانی ۹۲۳ھ (۲۲/اپریل ۱۵۱۷ء) کو سلطان سلیم اول قاہرہ میں داخل ہوا، اور مصر کے آخری مملوک سلطان تومان بے کو باب زُویلہ کے سامنے پھانسی دیگئی، سلطان سلیم اور اس کے جانشین سلیمان نے نہایت فراست و دانائی سے ملک کے سیاسی حالات کو پیش نظر رکھ کر تمام انتظامات مکمل کئے، اور نئے پاشا یک کے حاکم کو کسی صورت میں زیادہ طاقتور نہ ہونے دیا، لیکن مملوکوں کے عہد میں فوجی جماعت کو جو فوقیت نظم و نسق میں دوسری جماعتوں پر حاصل تھی، اسے ترکوں نے پوری طور پر نہیں توڑا، اس سے مملوکوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کا ایک نیا ذریعہ حاصل ہوگیا، ملک پر ایک پاشا مقرر کیا گیا، اور فوج کی چھ پٹنیں افسروں (بے) کے ماتحت وہاں بھیجی گئیں، اس کے علاوہ دو دیوان یا مجالس مشاورت تھیں تاکہ ان کی مدد سے تمام معاملات میں توازن قائم رکھا جائے، تقریبًا سو برس تک پاشا کے اختیارات محدود رہے، لیکن بہت سے تلخ تجربوں کے بعد باب عالی نے اپنے والیان مصر کو ہر دو سال کے بعد بدلنا شروع کیا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کوئی پاشا مستقل قوت

حاصل نہ کرسکا، مگر اب پاشاؤں کا ایک سلسلۂ نامتناہی شروع ہوتا ہے، یہ پاشا صرف دو سال ملک میں رہتے تھے، اور فوج مستقل تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے افسر زیادہ با اقتدار ہوتے چلے گئے، بلکہ ایک لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مصر میں فوجی حکومت قائم ہو گئی، جس کے سامنے پاشا محض بے دست و پا تھے، اس سے شورشوں کا بازار گرم ہوا، یہاں تک کہ معزولیاں، کشت و خون اور قتل روزمرہ کی چیزیں بن گئیں جب باب عالی مملوکوں کا زور توڑنے میں ناکام رہا، اور یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی مدد کے بغیر ملک میں امن قائم رکھنا ناممکن ہے، تو مجبوراً باب عالی نے صرف وہ پاشا مصر میں بھیجنے شروع کئے، جو مملوکوں کے نامزد کردہ ہوتے تھے، یہ پاشا مملوکوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے، ان کا عزل و نصب انھیں کے رحم و کرم پر منحصر تھا، عہدہ داروں میں سب سے زیادہ با اقتدار قاہرہ کا حاکم تھا، جسے شیخ البلد کہتے تھے، اس کے بعد وہ عہدہ دار تھا جو امیر الحج کہلاتا تھا، لیکن یہ سب انتظامات اور تبدیلیاں مصر کو مرفہ الحال نہ بنا سکیں، اور رفتہ رفتہ ملک کی خوشحالی رخصت ہوتی چلی گئی،

کسی زمانہ میں مصر کا خراج چھ لاکھ پیاسٹر تھا، لیکن یہ برابر کم ہوتا چلا گیا، اور آخر میں بالکل بند ہو گیا، اس دور کی تاریخ میں بہت کم تحقیق کی گئی ہے، اور واقعہ یہ ہے، کہ اس پورے دور میں ایک ہی سے واقعات ہمیشہ ہیر پھیر کر ہوتے رہتے تھے، اور ان میں مورخ کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، قسطنطنیہ سے پاشا مقرر ہو کر آتے تھے، ملک میں مسلسل جنگ اور بدامنی پھیلی رہتی تھی، اور ہر عہدہ دار تمام اختیارات پر قبضہ و تصرف کی کوشش میں رہتا تھا، کبھی کبھی مصری فوج باب عالی کی طرف سے شام، عرب اور ایران کی جنگوں میں شریک ہوتی تھی، لیکن مصریوں کو ان جنگوں سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ فائدہ، اس پورے عہد میں اکثر وباؤں اور قحط کے حالات پڑھنے میں آتے ہیں، اور ہر وبا یا قحط گذشتہ مصیبت سے سخت تر ہوتی چلی جاتی ہے، صرف ایک مرتبہ معلوم ہوتا تھا، کہ ایک زبردست تبدیلی ہونے والی ہے، سنہ ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸ء) میں جنگ روس و ترکی کے دوران میں ابتری سے فائدہ اٹھا کر علی بے نے بغاوت

کی، اور مصر و شام کی قسمت ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی، لیکن ایک واقعہ نے حالات بدل دیئے، ورنہ ممکن تھا کہ شام کو بھی وہی ترقی نصیب ہوتی، جو محمد علی پاشا کی وجہ سے مصر کو بعد میں نصیب ہوئی، ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) میں ایک دوست کی غداری کی وجہ سے علی بے کو شکست ہوئی اور باب عالی نے شورش کو مٹانے کی غرض سے ایک فوج کپتان حسان کی سرکردگی میں مصر روانہ کی، یہ دراصل مصر کو دوبارہ قابو میں لانے کی کوشش تھی، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ باب عالی روس کے معاملات طے کرنے میں اس قدر مشغول تھا، کہ مصر کی طرف پوری توجہ نہ کرسکا، ابراہیم بے اور مراد بے میں اتنی صلاحیت تو ضرور تھی، کہ حالات پر قابو پا لیتے مگر وہ باہمی جھگڑوں میں ایسے پھنسے کہ کچھ نہ کرسکے، ان تنازعات میں عوام بھی دخل دینے لگے، خانہ جنگی شروع ہو گئی، اسی دوران میں جب کہ لامرکزیت آخری حد کو پہونچی ہوئی تھی، مصر پر نپولین حملہ آور ہوا، ابراہیم بے اور مراد بے اس کے مدمقابل تھے، نپولین کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اس حملہ سے دول یورپ نے مصر کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا، اور مصر کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوا،

تلخیص و تبصرہ

ایک قابلِ تقلید تعلیمی تجربہ

ذیل کے مضمون میں لٹریری ڈائجسٹ (۱۹ فروری ۳۸ءھ) کے ایک مقالہ نگار نے ایک قابلِ تقلید تعلیمی تجربہ کا ذکر کیا ہے، جس کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے مفید ہوگا جو بچوں کی ذہنی نشو و نما سے دلچسپی رکھتا ہو، آج کل جب کہ ہمارے ملک کے ماہرینِ تعلیم ابتدائی تعلیم کے میدان میں ایک نیا قدم اٹھانے والے ہیں، ضرورت ہے کہ بچوں کی ذہنی استعداد کی جانچ کر کے نیویارک کے مذکورۂ ذیل اسکول کے نمونہ پر دو بھی ایک ادارہ یہاں قائم کریں، تاکہ جو بچے غیر معمولی طور پر ذہین پیدا ہوئے ہیں، وہ اپنی فطری استعداد کو آزادی کے ساتھ ترقی دے سکیں، اور ان کی خداداد قوتیں مروجہ تعلیمی نصاب کے دائرہ میں محدود نہ رہ جائیں، ،م

اگر آپ کسی روز سہ پہر کو نیویارک شہر کے پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ میں جس کو اسپیئر اسکول (Speyer School) بھی کہتے ہیں، چلے جائیں، تو آپ کو ایک ایسا تعلیمی ماحول نظر آئے گا، جس کی نظیر کسی دوسرے پبلک اسکول میں نہ ملے گی، وہاں پچاس لڑکے اور لڑکیاں جن کی عمریں آٹھ سے گیارہ سال تک ہیں، حیرت انگیز ذہنی قوت کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں کوئی شطرنج کی ایک پیچیدہ چال پر غور کر رہا ہے، کوئی کسی مشین کے چلانے کا طریقہ دوسرے کو سمجھا رہی ہے، ایک طرف کچھ بچے ٹیلیفون، ریڈیو اور طاقت کے پیدا ہونے اور منتقل ہونے کے نظریوں کا مطا

کر رہے ہیں، کچھ موسیقی اور شاعری سے لطف اندوز ہونے کے اصولوں پر بحث کر رہے ہیں، ایک جماعت ایسی ہے جو ایک مستند انسائیکلو پیڈیا میں آٹھ غلطیاں نکالنے کے بعد اس کے مولفین پر برہم ہے، اور بمشکل اس کتاب کو آگ میں ڈال دینے سے باز رہتی ہے، یہ غیر معمولی بچے اپنے پسندیدہ اخبار صبح کو اسکول آتے ہوئے راستہ میں پڑھتے ہیں، اور اہم مسائل پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ پریسیڈنٹ کی سونا خریدنے کی پالیسی اقتصادی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح یا غلط ہوگی، یہ پچاس بچے نیویارک کے لاکھوں اسکول کے بچوں میں سے منتخب کئے گئے ہیں، اور ان کا انتخاب صرف فطری ذہانت کی بنا پر کیا گیا ہے، یہ مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں اسکاچ، انگلش، سویڈش، ڈچ، آئرش، پولش، نیگرو، یہودی، جرمن اور ہنگیرین سبھی شامل ہیں، ان میں سے ہر بچہ کی ذہنی استعداد (Intelli gence quotient) (۱۳۰) سے زیادہ ہے، (اوسط ذہنی استعداد (۱۰۰) ہوتی ہے) انہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی، ایسے ہیں جن کی ذہنی استعداد (۲۰۰) ہے، اور بیس سال سے جب سے بچوں کی ذہنی جانچ کا طریقہ ایجاد ہوا ہے، اس سے زیادہ استعداد آج تک نہیں پائی گئی ہے (۱۴۰) کی ذہنی استعداد اس بات کی علامت ہے، کہ بچہ اپنے اندر کسی بڑے اور اوریجنل تخلیقی کام کی اہلیت رکھتا ہے،

پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کی تحریک ایک ضعیف العمر خاتون ڈاکٹر لِٹّا ہولنگ ورتھ (Dr. Lela Hollingworth) کی رہین منت ہے، جو صوفتہ بچوں کی نفسیات کی ماہر اور ایک ممتاز معلمہ ہیں، بارہ سال سے زیادہ ہوئے، انھوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کے خلاف آواز اٹھائی تھی جس میں لاکھوں روپے غبی بچوں پر صرف کئے جاتے ہیں، اور طباع بچوں کی غیر معمولی ذہانت کو ایک ایسے نصابِ تعلیم کے ذریعہ رائگاں کیا جاتا ہے، جو معمولی دماغ والوں کے لئے تیار کیا گیا ہے چنانچہ اسی وقت سے ڈاکٹر ہولنگ ورتھ کمزور دماغ کے بچوں کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر خود تمام تر ذہین بچوں

کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئیں، پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ پر نہ کوئی جائداد وقف ہے، اور نہ اس کے اخراجات خاص طور پر زائد ہیں، یہ ایک معمولی پبلک اسکول ہے، جیسا کہ ہر بڑے شہر میں تعلیمی بورڈ کی طرف سے قائم کیا جاسکتا ہے، جب ضرورت ہوتی ہے، تو زائد سامان اُن اداروں کی طرف سے جو اس کام میں دلچسپی لیتے ہیں بہم پہنچی اور بلامعاوضہ فراہم کردیا جاتا ہے،

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اساتذہ بچوں کی ذہانت کا اندازہ کرنے میں افسوسناک حد تک ناکام ثابت ہوئے، جب تک دماغی جانچ کے طریقے ایجاد نہیں ہوئے تھے، اساتذہ بچوں کی ذہنی استعداد کے دریافت کرنے میں صرف بیس سے چالیس فی صدی تک کامیاب ہوئے تھے، وجہ یہ ہے کہ جب ایک ذہین بچہ اسکول کے کام سے جو اس کے لئے آسان ہوتا ہے، گھبرا جاتا ہے، تو پھر وہ بے پروا ہوجاتا ہے، یا شریر ہوجاتا ہے، چنانچہ پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کے بعض بچے بھی جب وہ دوسرے اسکولوں میں تھے طرح طرح سے اپنا وقت ضائع کرتے تھے، کوئی عبارت کو نیچے سے اوپر کی طرف پڑھنے کی مشق کرتا تھا، اور کوئی نیچے کی طرف، ایک بچہ نقشہ کشی میں اپنا وقت صرف کرتا رہتا تھا، اور استاد کی سخت کوشش اور سرزنش کے باوجود اس عادت سے کسی طرح باز نہ آتا، اس لڑکے کی جانچ کی گئی، اور اس کو اس اسکول میں بھیج دیا گیا، اور اب وہ یہاں سہ پہر کے وقت نہایت عمدہ نقشے کھینچا کرتا ہے،

کارٹون بنانے والے جب کسی حیرت انگیز ذہانت والے لڑکے کی تصویر کھینچتے ہیں، تو اس کا چہرہ سوکھا ہوا اور سینہ دبا ہوا دکھاتے ہیں، یہ تصویر نہایت غلط ہوتی ہے، ذہین لڑکے اوسط درجہ کی ذہانت رکھنے والوں کی بہ نسبت عموماً زیادہ طاقتور، قد و قامت میں زیادہ بڑے اور زیادہ تندرست ہوتے ہیں، جسمانی خوبصورتی میں بھی پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کے بچے معمولی بچوں سے نمایاں طور پر فائق ہیں، وہ عموماً جماعت میں رہنا پسند کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس اسکول کے بچے ہائی اسکول میں تو اسی عمر میں پہونچیں گے، جب دوسرے اسکولوں کے بچے پہونچیں گے، لیکن ہائی اسکول میں

داخلہ کے وقت ان کے پاس معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہوگا، جو بہتیرے گریجویٹ لڑکوں کے لئے قابل فخر ہوسکتا ہے،

پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ میں اسکول کا معمولی کام صبح کو ختم ہوجاتا ہے، سہ پہر کا وقت اُن کاموں کے لئے خالی رہتا ہے، جن میں بچوں کو خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے، وہ اپنے لئے کام خود ہی پسند کرتے ہیں، یہ کام مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً روشنی کرنے کا مسئلہ، ہوائی راستوں سے آمد و رفت رسل و رسائل کے طریقے، وغیرہ وغیرہ ان شعبوں میں یہ بچے جن کی عمریں صرف آٹھ سال سے گیارہ سال تک ہوتی ہیں، بطور خود ریسرچ کرتے ہیں، اور بغیر کسی کی مدد کے کتب خانوں میں حوالہ کی کتابوں کو خود تلاش کرلیتے ہیں، اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں،

حیرت انگیز بچوں سے متعلق ڈاکٹر ہولنگ ورتھ اور ان کے ساتھیوں نے بہتیرے مشہور خیالات کو غلط ثابت کردیا ہے، مثلاً یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ گندہ ماحول ہی کی وجہ سے گلی کوچوں کے رہنے والوں میں سے کوئی اعلیٰ دماغ کا لیڈر پیدا نہیں ہوتا، ڈاکٹر ہولنگ ورتھ نے اپنے تیرہ سال کے تجربہ میں یہ دیکھا ہے کہ کسی نیچے خاندان سے اعلیٰ ذہانت کا بچہ کبھی نہیں آیا، ذہین بچوں کی اکثریت کامیاب خاندانوں ہی سے آتی ہے، ایک ایسی دنیا میں جہاں چین و آرام اور عیش و عشرت پسندیدہ چیزیں خیال کیجاتی ہیں، عموماً قوم کے اہل ترین افراد ہی ان کو حاصل کرسکیں گے، جو اہلیت کم رکھتے ہیں وہ ان کے حصول میں غالباً ناکام رہیں گے، جیسا کہ ڈاکٹر ہولنگ ورتھ کہتی ہیں، "ادنیٰ اوسط، اور اعلیٰ طبقوں میں نوع انسانی کی تقسیم جو نہایت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے، اقتصادی نقطہ نظر سے حیاتیاتی بنیادوں پر قائم ہے، اُن تمام کوششوں کے باوجود جو اسے منسوخ کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے عمل میں لائی جارہی ہیں، یہ تقسیم ابھی تک قائم ہے"۔

اوسط درجہ کے ذہین یا غبی والدین کا ایک ذہین بچہ کو پیدا کرنا ایسا ہی محال ہے، جیسا ایک

ٹماٹر کے پودے سے بیر کا پیدا ہونا، اس میں شبہہ نہیں کہ کامیاب خاندانوں میں غبی بچے بھی پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس بھی کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے، اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے، کہ ایک ذہین شخص کسی ایسی عورت سے شادی کرے، جو ذہنی قوت میں اُس سے فروتر ہو، اور بچے کو ماں کا دماغ ملے یا ایک اعلیٰ دماغ کی عورت کسی ایسے شخص سے شادی کرے، جو ذہنی قوت میں اُس سے کم ہو، لیکن باوجود اسکے بچہ ماں ہی کا دماغ پائے،

غیر معمولی ذہانت والے بچے عموماً وہی ہوتے ہیں، جو اپنے والدین کے پہلے یا اکلوتے بچے ہوتے ہیں، اور بچہ کی ولادت کے وقت ایسے والدین کی عمریں بھی عموماً اوسط سے زیادہ ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں، وہ اکثر اُس وقت تک شادی نہیں کرتے، جب تک اپنے لئے کوئی مستقل پیشہ اختیار نہ کریں،

جو بچے (۱۴۰) سے اوپر ذہنی استعداد رکھتے ہیں، ان میں لڑکوں اور لڑکیوں کا باہمی تناسب یہ ہے، کہ (۱۱۱) لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیاں (۱۰۰) ہوتی ہیں، (ہر نشیت میں لڑکے لڑکیوں سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں) عام خیال کے برخلاف یہود کے بچے دوسری نسل کے بچوں سے زیادہ ذہین نہیں ہوتے، یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ نیگرو بچے سفید نسل والوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اوسط درجہ پر آجاتے ہیں، اس اسکول میں تین نیگرو بچے ہیں، جن کی ذہنی فوقیت تمام عمر قائم رہے گی،

سوال ہوتا ہے کہ ذہنی استعداد کی جانچ بجائے خود کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہے چھ سال سے کم اور سولہ سال سے زیادہ عمر والوں کے لئے تو جانچ کا کوئی قابل اعتماد طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن ان حدود کے اندر اسٹینفرڈ بنیٹ کے طریقے (Stanford- Binet Tests) قابل اعتماد ہیں، مختلف ماہروں نے بچوں کو متعدد سالوں کے وقفہ کے بعد جانچا ہے، لیکن اُن کے نتائج میں پانچ پوائنٹ سے زیادہ کا فرق شاذ و نادر ہی پایا گیا ہے،

چونکہ جانچ کے یہ طریقے نسبتہً حال میں جاری کئے گئے ہیں، اس لئے بہت کم بچے ایسے ہیں، جن کی غیر معمولی ذہانت بچپن میں دریافت کر لی گئی، اور پھر کالج کے درجوں تک ان کی ذہنی استعداد کا تجربہ کیا گیا، اُن پانچ بچوں میں سے جن کی ذہنی استعداد ابتدائی مدرسہ کی جانچ میں (۱۸۰) سے زیادہ ثابت ہوئی تھی، گذشتہ سال دو نے علمی پیشوں میں اپنی غیر معمولی حیثیت قائم کر لی ہے، ایک نے تاریخ میں اور دوسرے نے ریاضیات میں اوریجنل ریسرچ کو مکمل کیا تھا، اور تکملہ کے وقت دونوں کی عمریں (۲۲) سال سے کم تھیں، ان پانچ میں سے چار نہایت نمایاں امتیاز کیساتھ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے ہیں، ذہنی استعداد انسان کی تمام عمر میں یکساں رہتی ہے، اور بچہ اعلیٰ دماغ کا انسان بن جاتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اچھے دماغوں کی نگرانی نہایت اہمیت رکھتی ہے، تعلیم کے ذریعہ آپ فطری ذہانت پیدا نہیں کر سکتے، تعلیم صرف اوزار فراہم کر سکتی ہے، جس سے ذہانت کام لیتی ہے، ہمارے آیندہ لیڈر ہمارے سامنے ہیں، اور اب وہ بچپن ہی میں پہچانے جا سکتے ہیں، یہ چیز تاریخ میں پہلی بار دیکھی جا رہی ہے، ان لیڈروں کی طرف سے ہماری بے پروائی سخت کوتاہ بینی پر مبنی ہے، ہمارے لئے صرف یہی مستقبل کے لیڈر ہیں، اگر ان کی اہلیت اور قابلیت کو منتشر ہو جانے دیا گیا، تو ہم اس کی تلافی نہ کر سکیں گے،

"ع ز"

اخبار علمیہ

تعلیمی رپورٹ

حکومتِ ہند کی تازہ تعلیمی رپورٹ بابت ۳۶-۱۹۳۵ء کا حسب ذیل خلاصہ کلکتہ کے ہفتہ وار "مسلمان" (انگریزی) مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے:

ایجوکیشنل کمشنر اس رپورٹ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "زیر نظر سال کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے، کہ صوبوں، تعلیمی جماعتوں اور افراد کی طرف سے روز بروز زیادہ توجہ تعلیم پر کیجا رہی ہے"

موجودہ نظام تعلیم کے خلاف ایک عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے، تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابتدائی تعلیم کے انتظام میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، اور وہ بالکل ناکافی ہے، جبری ابتدائی تعلیم ابھی اتنی ہی دور نظر آتی ہے جتنی پہلے تھی، پڑھے لکھوں کی تعداد میں سالانہ ترقی کا اوسط بہت ہی کم ہے، یونیورسٹیوں میں بہت سے طلبا ایسے ہیں، جو اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے، تعلیم یافتہ طبقوں میں بیروزگاری عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، اور لڑکیوں کی تعلیم کا اندازہ حد درجہ ناکافی ہے،

تعلیمی اداروں کی تعداد میں (۲۰۵۲) کی کمی ہوگئی ہے، ۱۹۳۵ء میں ان کا شمار (۲۵۶۲۶۳) تھا ۱۹۳۶ء میں (۲۵۴۲۱۱) رہ گیا، یہ تخفیف زیادہ تر ابتدائی مدارس میں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جو مدارس کافی طور پر تعلیم نہیں دے سکتے تھے، وہ بند کر دیئے گئے ہیں، لیکن اس کے باوجود طلبہ کی تعداد میں (۳۰۹,۲۸۰)

کا اضافہ ہوگیا ہے، اور ۳۶-۱۹۳۵ء میں اُن کی مجموعی تعداد (۱۳،۱۶،۱۴۹) ہے،

برطانوی ہند میں تعلیم کے مصارف میں تقریباً (۸۱) لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں تعلیمی اخراجات کی مجموعی رقم (۲۶½) کرور سے زیادہ تھی، ۱۹۳۶ء میں یہ (۲۷) کرور (۳۳) لاکھ ہوگئی، اس اضافہ میں سے صرف (۹½) لاکھ لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ ہوئے، لہذا یہ تجویز پیش کی گئی ہے، کہ اضافہ کی رقم میں سے لڑکیوں کی تعلیم پر اور زیادہ خرچ کرنا چاہئے، اور آیندہ جو اسکیمیں تعلیم کی ترقی کے لئے بنائی جائیں، ان میں لڑکیوں کی تعلیم کا خیال پہلے کیا جائے،

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جن میں مخصوص پیشوں کے کالج بھی شامل ہیں، طلبہ کی تعداد میں (۷،۱۰۵) کا اضافہ ہوا، اور ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد (۱۲۴،۵۰۸) تک پہونچ گئی، لڑکوں کے اینگلو ورنا کیولر سکنڈری اسکولوں کی تعداد میں (۱۴۰) کا اضافہ ہوا، اور ان کے طلبہ کی تعداد میں (۵۳،۸۰۹) کا، لیکن لڑکوں کے ورنا کیولر سکنڈری اسکولوں کی تعداد بقدر (۶۰) کے گھٹ گئی، اور ان کے طلبہ کی تعداد میں بھی (۷،۹۳۹) کی کمی ہوگئی، کسی حد تک یہ تخفیف اقتصادی اسباب کی بنا پر ہو سکتی ہے، کہا جاتا ہے، کہ دیہات کے لوگ اس قدر غریب ہوگئے ہیں، کہ وہ اپنے بچوں کی فیس بھی ادا نہیں کر سکتے حالانکہ ورنا کیولر اسکولوں کی فیس بہت کم ہے، لیکن اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ورنا کیولر مڈل اسکول اینگلو ورنا کیولر (انگریزی) اسکولوں کے مقابلہ میں نامقبول ہیں، ورنا کیولر مڈل اسکول کے طلبہ کو اب ملازمتوں میں ترجیح نہیں دیجاتی، خواہ وہ نمایاں طور پر اہلیت رکھتے ہوں، علاوہ بریں ان اسکولوں کے فارغ التحصیل طلبہ اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں، تو انھیں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

لڑکوں کے سکنڈری اسکولوں کے اخراجات میں تقریباً (۷،۲) لاکھ کا اضافہ ہوا، ۱۹۳۶ء میں ان پر (۷،۳۳۵،۴۳۹،۱) روپئے صرف ہوئے،

لڑکوں کے پرائمری اسکولوں میں اگرچہ (۱۳۴۸) اسکولوں کی تخفیف ہوگئی، تاہم طلبہ کی تعداد

میں (۲۰۱،۱۱۲) کا اضافہ ہوا، اخراجات کی رقم میں بھی اس سال (۱۳،۲۹،۰۵۲) روپیہ کا اضافہ ہوا، اور وہ (۹،۸۲،۸۸،۱۶۰) روپیہ تک پہونچ گئی، پرائمری اسکولوں میں روپیہ اب بھی بہت ضائع ہوتا ہے، تمام برطانوی ہند میں اس کے ضائع ہونے کا اوسط لڑکوں کے اسکولوں میں (۷۳) فی صدی اور لڑکیوں کے اسکولوں میں (۸۶) فی صدی ہے، خوش قسمتی سے چند صوبوں میں کچھ نمایاں ترقی دکھی جاری ہے، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان پڑھے لکھوں کی تعداد میں حسب ذیل ترقی پائی گئی ہے،: صوبہ مدراس میں (۳۱) سے (۳۲) فی صدی، بمبئی میں (۴۱) سے (۴۵) فی صدی، صوبہ جات متحدہ میں (۲۵) سے (۲۹) فی صدی، اس لئے امید کیجاتی ہے، کہ اگر ترقی کی یہ رفتار بھی قائم رہی تو حالات بہت کچھ بہتر ہوجائیں گے،

جبری ابتدائی تعلیم برطانوی ہند کے (۱۶۰) شہری حلقوں اور (۱۰۳۵۵) دیہاتوں میں جاری کردی گئی ہے، لیکن مقامی کمیٹیوں کی بے پروائی کی وجہ سے جبری تعلیم کا جو اثر ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، اس بات کی سخت کوشش کرنی چاہئے، کہ جن بچوں کا داخلہ اسکولوں میں ہوچکا ہے، وہ پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے رہیں، تعلیم کا معیار بلند ہو، وہی اساتذہ مقرر کئے جائیں، جو طریقۂ تعلیم سے اچھی طرح واقف ہوں، ابتدائی تعلیم کے انتظام میں زیادہ سختی برتی جائے، اور ایسی عمارتوں میں تعلیم نہ دی جائے جہاں بچوں کی صحت پر مضر اثر پڑے،

لڑکیوں کی تعلیم میں کافی ترقی ہوئی، زیر تعلیم لڑکیوں کی تعداد (۲،۸۹۰،۲۴۶) سے جو ۱۹۳۵ء میں تھی، ۱۹۳۶ء میں (۳،۰۱۲،۴۴۴) ہوگئی، گوکہ لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد (۳۹،۷۰۱) سے گھٹ کر (۳۸،۳۹۰) رہ گئی، اس تعداد میں زیادہ تر تخفیف بنگال میں ہوئی، جہاں بہتیرے اسکول جنکی حاضری کم، تعلیم ناکافی اور اخراجات زیادہ تھے، بند کردیئے گئے، اور متعدد اسکولوں کو جن میں لڑکیاں کم تھیں ایک دوسرے سے ملا دیا گیا،

لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے خلاف جو تعصب تھا وہ رفع ہورہا ہے، صوبہ جات متحدہ، مدراس اور آسام میں لڑکوں کے ابتدائی مدرسوں میں لڑکیوں کی تعداد بہ نسبت لڑکیوں کے مدرسوں کے زیادہ تھی، لیکن باوجود اس کے مقامی کمیٹیاں جن کے ہاتھوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے لڑکیوں کی تعلیم میں جیسی چاہئے ویسی دلچسپی نہیں دیتیں، اگرچہ لڑکیوں کے تمام تعلیمی اداروں پر (۹،۲۸،۳۵۷) روپئے زیادہ صرف ہوئے، اور اس سال ان کے اخراجات کی مجموعی رقم (۳،۰۳،۹۸،۱۱۴) روپئے تھی، تاہم پنجاب، آسام اور صوبہ جات متوسط کے علاوہ اور تمام صوبوں میں حکومت کی طرف سے جو رقم لڑکیوں کی تعلیم پر صرف ہوئی، اس کا اوسط کم ہوگیا، تقریباً ہر جگہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی گئی،

اس سال مسلمان طلبہ کی تعداد میں (۲۳،۵۱۷) کا اضافہ ہوا، اور مسلم طالبات کی تعداد میں (۲۶،۳۷۰) یعنی لڑکوں کی تعداد کی بہ نسبت لڑکیوں کی تعداد میں زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی،

نیچی قوموں کی تعلیم میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے، اور طلبہ کی تعداد میں (۸۰،۰۰۰) سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے، ان قوموں کے خلاف تعصب زائل ہوتا جارہا ہے، اور ان کے بچے بھی روز بروز زیادہ تعداد میں عام مدرسوں میں داخل ہورہے ہیں،

حرفتی اور فنی اداروں میں بھی (۱۲۱) کا اضافہ ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد (۸۲۹) تھی، ۱۹۳۶ء میں (۹۵۰) ہوگئی، اور ان کے طلبہ کا شمار بھی (۶۶،۳۱۹) سے (۷۰،۹۶۰) تک پہونچ گیا، زیادہ ترقی تجارتی، فنی اور صنعتی اسکولوں میں ہوئی،

"ع ز"

ادبیات

نذرِ آتش

از جناب پروفیسر فراق گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی

ہو ختم یہ عتاب کہیں رحم آچکے
گستاخِ عشق خون میں اپنے نہا چکے

مدت ہوئی کہ یاد کسی کی بھلا چکے
حرماں نصیب ہجر کے صدمے اٹھا چکے

کب سے لرز رہی ہے فضائے جہانِ عشق
اے حسن شرمسار تجھے شرم آچکے

سمجھے ہوئے تھے ہم سفرِ زندگی جنھیں
وہ کاروانِ درد بھی منزل پہ جا چکے

اب ماورائے وہم و گماں ہو سکوتِ حسن
وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے

گذرے گا ہو کے شہر خموشاں سے آج کون
لاکھوں طرح چراغِ لحد جھلملا چکے

اب عشق ہی رلائے تو کچھ رو سکیں کہ ہم
ہم بیکسانِ رنج و محن کو رُلا چکے

اے حسن بے نیاز یہ حالت بھی تابکے
دشمن کو دوست دوست کو دشمن بنا چکے

تجھ کو بھی کچھ ہے معرکہ آرائیوں کا ہوش
لب تشنگانِ برقِ نظر کام آچکے

اب حسن کی گھٹیں کہ بڑھیں فتنہ خیزیاں
مدت ہوئی کہ ہوش میں دیوانے آچکے

پرپیچ اور عقدۂ ہستی کو کر دیا
جب آئینے میں گیسوئے پُرخم بنا چکے

اے دل یہ کب کی بات نکالی کہ اب انھیں
اگلے دنوں کے لطف و کرم یاد آچکے

ان کا بھی کیف تمکنتِ حسن بڑھ گیا
اپنے بھی نالے عرش کے پائے ہلا چکے

دل پر کبھی فریبِ سکوں کے بھرم کھلیں
یونہی تقاضۂ غم صبر آزما چکے،

اب اور رنگِ عالمِ امکاں نظر میں ہے
آنکھوں میں اس دیار کے جلوے سما چکے،

پھر شوقِ وصل و حوصلۂ دید پوچھنا،
کچھ راہ پر مزاجِ غمِ ہجر آچکے،

اس شوخیِ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
کھوئے نہ ہم گئے تھے ابھی اور وہ پا چکے،

بیتابِ دید آج بھی بیتاب دید ہیں،
لاکھوں طرح جمالِ خود آرا دکھا چکے،

اے دل حیاتِ عشق کا پانا محال ہو
ہم جان تک تو اپنی اسی میں گنوا چکے،

تقدیر میں ہر اک کی یہ برقِ ادا نہیں
تجھ پر وہ اے فراقِ حزیں مسکرا چکے

سخنِ ماہر

از جناب ماہر القادری

نالہ ہم رنگِ تکلم مری آواز میں ہے
یعنی اب تک غمِ الفت کی خلش راز میں ہے

بیقراری ہی سے پایا ہے تو نے فروغ
عشق کی جلوہ گری حسن کے انداز میں ہے

کاش سمجھے کوئی کلیوں کی چٹک کا مفہوم
یہ بھی اک "لے" ہے جو شامل تری آواز میں ہے

ہمتِ اہلِ نظر پست ہوئی جاتی ہے،
بے نیازی کا وہ عالم نگہِ ناز میں ہے،

رحم کر! رحم! زمانے پہ مرے دل کو نہ چھیڑ
حشر اک پردہ اسی ٹوٹے ہوئے ساز میں ہے

طالبانِ کرمِ یار جفا پر مٹ جائیں،
وہ تو یہ کہئے کہ مفہومِ کرم راز میں ہے

اُس تصور سے عبارت ہے حیاتِ ماہر
جو تصور کہ تری انجمنِ ناز میں ہے

———•———

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے، اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے، چند خصوصیات ملاحظہ ہوں،:-

۱- یہ بالکل جدید ترین لغت ہے، انگریزی زبان میں ابتک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں، وہ تقریباً تمام کے تمام آ گئے ہیں،

۲- اسکی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ انکے معنی بھی شامل ہیں جنکا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے، اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں، جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں،

۳- ہر ایک لفظ کے مختلف معنی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں، اور امتیاز کے لئے نمبر شمار دیدیا گیا ہے،

۴- ایسے الفاظ جنکے مختلف معنی ہیں اور انکے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، انکی وضاحت مثالیں دیکر کیگئی ہے،

۵- اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے، کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورہ کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے، اور اس غرض کیلئے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کیگئی ہے، یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی،

۶- اُن صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کے مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں، جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں،

۷- اس لغت کے لئے کاغذ طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا، جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے، طباعت کیلئے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں، جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے،

(ڈمائی سائز صفحات ۵۱۲+۲۴ قیمت ۱۶ روپئے، کلدار علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۂ کافرون، مولینا حمید الدین فراہی، مرتبہ مولینا امین احسن اصلاحی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۴ر، پتہ دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ،

یہ رسالہ ترجمان القرآن مولینا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کے تفسیری رسائل کے اردو ترجمہ کے مفید سلسلہ کا ساتواں نمبر ہے، مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیروں کی خصوصیات ارباب علم میں اتنی متعارف ہو چکی ہیں، کہ ان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیر میں جن سے مفسرین عموماً سرسری گذر جاتے ہیں، مولینا کی فکر سلیم نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے باغ لگا دیتی ہے، یہ مختصر رسالہ بھی اس خصوصیت کا حامل ہے، قدیم مفسرین کے نزدیک بھی سورہ کافرون کفار سے برأت و جنگ کا اعلان ہے، یعنی تبلیغ اور دعوت الی الحق کے تمام وسائل صرف کر دینے کے بعد بھی جب کفار اپنی گمراہی پر اڑے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ان سے قطع تعلق، ہجرت اور اعلانِ جنگ کا اذن دے دیا، مولینا نے اس حقیقت کو اس سورہ کے ناموں کی لغوی تحقیق، الفاظ کے معنی، سورہ کے زمانۂ نزول، اس کے ماقبل و مابعد کی سورتوں کے مضامین بعثت کے مراحل یعنی دعوت الی الحق اور اس سے انکار کی صورت میں کامل اتمام حجت کے بعد کفار سے اعلان برأت، ہجرت، اعلان جنگ اور غلبۂ حق، اور دعوت نبوی کے ان تمام مراحل کی دوسرے انبیا علیہم السلام خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے مراحل سے مطابقت کر کے اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ بعثت کے مراحل کے باب میں خدا کی سنت اور سورۂ کافرون کا اعلانِ برأت ہونا پورے طور سے ذہن نشین ہو جاتا ہے، ترجمہ نہایت شستہ ہے،

تسہیل البیان فی رسم نظم القرآن، مولفہ جناب قاری محمد نظر صاحب، تقطیع بڑی ضخامت

۱۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ محمد راشد امروہوی چوبداری محلہ و شبلی بک ڈپو لکھنؤ،

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قرآن پاک کے رسم الخط اور اس رسم الخط کے اصول ونظام پر ہے ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں قرآن پاک کے تدریجی نزول کے مصالح سورتوں کے ناموں ان کی اور آیات کی ترتیب کے توقیفی ہونے آنحضرت صلعم کی حیات مبارک میں قرآن پاک کی تدوین صحابہ کرام کے جمع حفظ اور کتابت قرآن، حفاظ صحابہ، "نَزَلَ القُرآن علی سَبعَۃِ اَحرُف" کا مقصد و مدعا جماعت صحابہؓ اور تابعین کے اکابر قرار، نمازوں میں ترتیل، تدویر اور حدر کے ساتھ قرأت، حضرت عثمانؓ کی اشاعت قرآن کے اسباب اور قرآن پاک کے رسم الخط کے منجانب اللہ ہونے کے متعلق معلومات ومباحث کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کے بعد قرآن پاک کے رسم الخط یعنی حروف مقطوع موصول، تائے تانیث، ہمزۂ وصل، محذوفات، زوائد الف کی کتابت، اس کے متعلق جزئیات اور ان سب کی مختلف صورتوں میں طریقۂ کتابت کی تفصیلات ہیں، آخر میں پورے کلام اللہ کے رسم الخط پر اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، یہ کتاب قاری اور غیر قاری سب کے مطالعہ کے لائق ہے رسالہ عربی زبان میں ہے، ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے،

دکن میں اردو، مولفہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ اچھا کتابت وطباعت معمولی قیمت ہے، پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن،

دکن میں اردو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی پرانی اور مشہور تالیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن آج سے بارہ تیرہ سال پہلے شائع ہوا تھا، پھر ایک ہی سال کے اندر ترمیم واضافہ کے ساتھ دوسرا نکلا اب یہ تیسرا اڈیشن ہے، اور جدید معلومات کے اضافہ اور ترتیب کتاب کے لحاظ سے پہلے دونوں اڈیشنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جامع اور مکمل ہے، یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے، اہل دکن کی کاوشوں نے اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ کے پرانے نظریوں کو بہت کچھ بدل دیا ہے، ممکن ہے آیندہ تحقیقات سے اور نئے انکشافات ظہور میں آئیں، اردو زبان نے جس سرزمین میں بھی جنم لیا ہو،

لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کے دوروں کو چھوڑ کر قدیم اور جدید دونوں دوروں میں اردو زبان کی سب سے زیادہ خدمت اور ترقی دکن میں ہوئی، اس لئے اس کو اردو زبان کا گہوارہ کہنا بالکل بجا ہے، اس کتاب کے آغاز میں اردو زبان کے مولد، دکن میں اسکی ابتدا، اور نظم ونثر کے آغاز پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد سنین، دکن کے حکمران خانوادوں اور فرمانرواؤں کے لحاظ سے دور مقرر کرکے ہر دور کے شعراء کے بقدر تعارف حالات، ان کے کلام کے نمونے اس عہد کی نثر کی تصانیف اور اس کے نمونے اور نظم ونثر پر تبصرہ ہے، آصفی دور کی اردو زبان کی ترقیوں کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، مرثیہ گو شعراء کے حالات علحدہ ہیں، پہلا دور ۷۴۲ھ سے ۹۰۰ھ تک بہمنی دوسرا دور ۹۰۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک ہیں تین خانوادے ہیں، قطب شاہی، عادل شاہی اور برید شاہی، تیسرا ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۳۶ھ تک مغلیہ اس کے بعد آصفی دور کے حالات ہیں، یہ دور کئی دوروں پر تقسیم ہے، چوتھا دور ۱۱۳۶ھ سے ۱۲۲۰ھ تک آصفجاہ اول اور آصف جاہ ثانی کا زمانہ پانچواں دور ۱۲۲۰ھ سے ۱۳۰۱ھ تک آصفجاہ ثالث سے آصفجاہ خامس تک چھٹا دور ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۳۶ھ آصفجاہ سادس سے قیام جامعہ عثمانیہ کے قبل تک، ساتواں دور ۱۳۳۶ھ قیام جامعہ عثمانیہ سے موجودہ عہد تک ان تمام دوروں کو اردو کی لسانی حیثیت اور اسکی وسعت وترقی کے لحاظ سے دو موٹے دوروں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا دور آغاز سے لیکر مغلوں کے خاتمہ تک، اس دور میں اردو زبان کی ترقی زیادہ شعر وشاعری تک محدود رہی اگرچہ نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں، لیکن زبان کا رنگ وہی قدیم رہا، آصفی دور میں نمایاں انقلاب ہوا، اور اس دور کے ہر حکمراں کے زمانہ میں اردو کا قدم آگے بڑھتا گیا، اس لحاظ سے یہ دور کئی دوروں پر تقسیم کیا گیا ہے، اسی دور میں سنجیدہ تصانیف کا آغاز ہوا، اخبارات ورسائل کا مذاق پیدا ہوا، اور عہد بعہد اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا، سنجیدہ تالیفات وتراجم کا سلسلہ شروع ہوا، اردو زبان دفتری زبان قرار پائی، سررشتہ علوم وفنون قائم ہوا، انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، کالج اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، دار الترجمہ قائم ہوا، مختلف علوم وفنون پر سینکڑوں کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں، متعدد علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہوئیں، اور حیدر آباد کی سرزمین

اردو زبان کی ترقی کا تماشا گاہ بن گئی، لائق مؤلف نے ان تمام دوروں کی ترقیوں کو سطحِ علیحدہ علیحدہ دکھایا ہے، کہ دکن میں اردو زبان کے تمام مدارج سامنے آجاتے ہیں لیکن دکن کے اردو زبان کے مولد ہونے اور شمالی ہند میں شاعری کی ابتدا کے بارہ میں فاضل مؤلف کا بیان بہت کچھ بحث طلب ہے،

رسالہ علمیہ (عربی) مرتبہ مولینا سید محمد ہاشم صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ اچھا، ٹائپ خوشنما، پتہ :- دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن،

گذشتہ سال جامعہ ازہر مصر کا وفد ہندوستان آیا تھا، سیاحت کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد بھی گیا، اس کے اعزاز میں وہاں کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف نے ایک جلسہ ترتیب دیا، جس میں ارکانِ ازہر کے علاوہ متعدد اربابِ علم نے علمی موضوعوں پر تقریریں کین اور مضامین پڑھے، مولینا ہاشم ندوی نے ان تقریروں اور مضامین کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس کا سرنامہ دائرۃ المعارف کے نام اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کے پیام سے مزین ہے، اس کے بعد ارکانِ وفد کے خیر مقدم میں ارکانِ دائرہ کا ایڈریس اور رئیس الوفد شیخ ابراہیم الجبالی کی جوابی تقریر ہے، پھر اور مقررین کی تقریریں ہیں "پرانے زمانہ میں علماء کے باہمی ارتباط کی حالت" مولوی شیخ عبد الرحمن یمانی رفیق دائرۃ المعارف "دولتِ آصفیہ کے علمی ادارے" مولوی حبیب عبد اللہ صاحب رفیق دائرۃ المعارف "اسلامی حضارت اور ہندوستان میں اس کے آثار" مولوی مسعود عالم صاحب ندوی سابق مدیر الضیاء "معجم المصنفین" مولوی عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی "اقتباس تقریر" استاذ عبد الوہاب رکن وفد "نظم" "امت اسلامیہ کا معجزہ" مولینا محمد ہبۃ اللہ صاحب پروفیسر نظام کالج "اور حیدرآباد میں عربی زبان کی خدمت" ڈاکٹر عبد الحق پروفیسر جامعہ عثمانیہ، یہ سب تقریرین اور مقالے عربی میں ہیں، یہ رسالہ نہ صرف مصری وفد کے ورود کی یادگار کی حیثیت سے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی لائقِ قدر ہے۔

ابنِ مریم، مولفہ جناب حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے، پنشنر ڈسٹرکٹ و سشن جج تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ نمبر ۲ فرید کوٹ روڈ لاہور،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، صلیب پر چڑھائے جانے اور موت کے بارہ میں جمہور اہل اسلام کا صحیح عقیدہ یہ ہے، کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے، آپ کو سولی نہیں دی گئی، اور آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے لیکن بعض جماعتیں تینوں مسائل میں اس سے مختلف عقیدہ رکھتی ہیں، ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ تھے، اور سولی پر آپ کی موت واقع ہوئی اور دونوں جماعتیں اپنے عقائد آیاتِ قرآنی سے مستنبط کرتی ہیں، یہ نہایت پامال مسائل ہیں، اور اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے، کہ مشکل سے اس پر کوئی نیا اضافہ کیا جا سکتا ہے، تاہم حاجی رحیم بخش صاحب کے دینی جذبہ نے آپ کو اپنے طریقہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کرنے پر آمادہ کیا، چنانچہ انھون نے جمہور اہلِ اسلام کے عقیدہ کو آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے، اور اس باب میں بائبل کے بیان کے اختلافات دکھا کر صحیح اسلامی عقیدہ کی تائید کی ہے، اور اسکے عقلی استحالوں کو دور کیا ہے، یہ کتاب مناظرانہ ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے،

آدابِ حق، مولفہ مولینا محمد ایوب صاحب باغ، تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ شیخ ابرار حسین منیجر آزاد اینڈ کو ڈگی بازار اجمیر شریف،

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے عقائد عبادات، معاملات، اخلاق تصوف، انسانی فضائل و رذائل اوامر و نواہی وغیرہ انسان کی اخلاقی تعلیم و تربیت کے متعلق بہت سے حکیمانہ اقوال و نصائح جمع کر دیئے ہین، انکی ترتیب حروف تہجی پر ہے، پہلے ہر تعلیم یا نصیحت کے متعلق مؤلف کی ایک رباعی ہے، اسکے بعد اسکے متعلق حکیمانہ اقوال اور اولیائے کرام کے مقولے اور نصائح ہین،

زمینِ کربلا، ترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۱۲/ پتہ :- مدرسہ معارف القرآن اورنگ آباد ضلع گیا،

مصر کے ایک اہلِ قلم علی جلال حسین نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے، مولوی محمد ایوب صاحب نے زمینِ کربلا کے نام سے اسکے اس حصہ کا جو واقعہ شہادت سے متعلق ہے، ترجمہ کیا ہے اور

میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے حالات میں متعدد مستند کتابیں موجود ہیں، علی جلال کی مذکورہ بالا ترجمہ
میں کوئی خاص اضافہ اور امتیاز بھی نہیں معلوم ہوتا، تاہم فائدہ سے خالی نہیں ہے، لیکن ترجمہ اور زبان بہت
خراب ہے، تذکیر و تانیث تک کی غلطیاں ہیں، ناہمواری کے لحاظ سے یہ ترجمہ اس زمانہ کا ترجمہ ہی نہیں معلوم ہوتا

گلدستہ مضامین و انشا پردازی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط

قیمت مرقوم نہیں، پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن علیگڈھ،

اس کتاب کی تکمیل میں تین معلمین کی کوششیں شامل ہیں، رمضان علی صاحب ایم اے نے
تالیف کی ہے، اختر علی صاحب ایم اے نے ترتیب دی ہے، اور محمد چراغ حسن صاحب ایم اے نے
نظر ثانی کی ہے، اس اہتمام سے یہ تیار ہوئی ہے، کتاب کئی حصوں پر تقسیم ہے، ایک حصہ میں جو دو سو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، مختلف انواع
مفید اشیاء کے متعلق معلومات اور اخلاقی تعلیم پر چھوٹے چھوٹے مفید مضامین ہیں، اسکے بعد مختلف مفید موضوعوں کی ترجمانی
و دیگر انکے متعلق مضامین کے اجزاء بتا کر نمونہ کے مختصر مضامین ہیں، پھر خطوط نویسی کے اصول و قواعد، مختلف قسم کے
خطوط اور تحریروں کے نمونے ہیں، آخر میں چند مشہور ادیبوں کے خطوط ہیں، اس کتاب کے مضامین اوسط درجہ کے طلبہ کیلئے مفید ہیں،

قصص الامثال مؤلفہ جناب خواجہ باقر حسن صاحب قادری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ

کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی،

ہر زبان میں ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے، ان میں سے بعضوں کے متعلق کچھ واقعات و حکایات
بھی ہوتے ہیں، جو انھیں ضرب الامثال بناتے ہیں، اردو میں بھی صدہا ضرب المثلیں ہیں، اور انکے متعلق کچھ نہ کچھ قصص و
حکایات بھی ہیں، خواجہ باقر حسین صاحب نے اس قبیل کی ڈھائی سو ضرب المثلوں اور انکے متعلقہ قصوں کو اس کتاب میں جمع کیا
ہے، اور جن اردو ضرب المثلوں سے ملتی ہوئی عربی فارسی یا انگریزی کی ضرب المثلیں مل گئی ہیں انھیں بھی درج کر دیا ہے،
کتاب کوئی تاریخی تو نہیں کہ اس کے تمام واقعات صحیح مانے جائیں، یا انھیں تاریخی معیار پر جانچا جائے، بلکہ
محض ادبی کتاب ہے، اور اس لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے، اور ایک حیثیت سے اردو زبان کی اچھی خدمت ہے،
"م"